تقسیمِ ہند

اور

اشتراکی نقطۂ نگاہ

ظفر عالمگیر یوسف زئی

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

تقسیم ہند

اور

اشتراکی نقطۂ نگاہ

مصنفہ
ظفر عالمگیر یوسف زئی
ایم اے (ادبیات، انگریزی) ایم اے سی سی (صحافت)

سول ایجنٹس
عوامی کتب خانہ نزد بولٹن مارکٹ
بندر روڈ کراچی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : تقسیم ہند اور اشتراکی نقطہ نگاہ

مصنف : ظفر عالمگیر یوسف زئی

تعداد : ایک ہزار

کتابت : عبدالقدیر

طباعت : باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی

اشاعت اول : جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

ناشر : آصفیہ اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر ۶۶۷۰ کراچی ۲

قیمت : ایک روپیہ پچھتر پیسے ۷۵

ذخیرہ کتب :۔ محمد احمد ترازی

قائدِ اعظمؒ کے ارشادات

●

"ہمارا مذہب جدا ہے، ہماری تہذیب جدا ہے، ہماری ثقافت جدا ہے، ہماری تقویم جدا ہے، ہم ایک علیحدہ مملکت چاہتے ہیں کہ جہاں ہم قرآنِ مجید کی دعوت اور تعلیمات کے مطابق حکومت کر سکیں۔

●

" آیئے ہم اس (اسلام) کو پاکستان کا آئندہ دستور بنائیں ہم ایسے (دستور) بنا کر دُنیا کو دکھادیں گے۔"

●

" اسلام کے اصول اپنی نظیر نہیں رکھتے، آج بھی یہ اصول اتنے ہی قابلِ عمل ہیں جتنے تیرہ سو سال پہلے تھے۔"

حرف اوّل

اُن لاکھوں مُسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں
کے نام

جنہوں نے برصغیر میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لئے اپنی عزیز جانیں قربان کر دیں جن کی عظیم قربانیاں آج بھی زندہ درخشندہ وتابندہ ہیں اور مملکتِ پاکستان ہی جن کی یادگار ہے۔

کیا

اس عظیم یادگار کو ہم سیاسی بازی گروں اور اوچھے قلابازوں کی اداؤں پر بھینٹ چڑھا دیں گے جسے ایک ظالم اور عیّار دشمن کی بے پناہ طاقت سے بچانے ۱۹۶۵ء میں ہمارے ہزاروں بھائیوں نے ہنستے کھیلتے اپنی پیاری جانیں قربان کی تھیں؟

ان شہیدوں کا مقدّس لہو آواز دے رہا ہے
پاکستان پاکستان ہے اور انشاء اللہ پاکستان ہی رہے گا
اس آواز کی لاج رکھنا ہر پاکستانی مسلمان کا اوّلین فرض ہے

قائدِ اعظم کے ارشادات

•

"ہم مسلمانوں کا ایمان ایک خدا، ایک کتاب اور ایک نبیؐ پر ہے اس بنا پر ہمیں قوم کی حیثیت سے ایک ہو کر رہنا چاہیئے بڑی پرانی کہاوت ہے کہ اتحاد باعثِ استقامت ہے اور نفاق باعثِ شکست"

(۷ر اپریل ۱۹۴۶ء)

•

"یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اُن زرّیں اصولوں پر عمل کرنے میں ہے جو ہمارے عظیم المرتبت واضعِ قانون محمدؐ رسول اللہ نے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں آیئے ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں حقیقی اسلامی اصولوں پر رکھیں"

(۱۱ر فروری ۱۹۴۸ء)

•

"آزادی کے معنی بے راہ روی ہرگز نہیں ہیں اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آزاد ہو کر آپ مملکت کے دوسرے شہریوں کے مفاد کا لحاظ کئے بغیر جو چاہیں سو کرنے پھریں .... اب پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گیا کہ ہم متحدہ ہو کر نظم و ضبط کے ساتھ کام کریں"

(۲۳ر مارچ ۱۹۴۸ء)

ہندوستان میں اشتراکیت کا آغاز

ہندوستان میں اشتراکیت نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کی ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا قیام عمل میں آیا تھا، یہ تنظیم آل انڈیا نیشنل کانگریس سے وابستہ تھی لیکن مارکسی اثرات بہرحال کارفرما تھے۔ ۱۹۲۴ء میں ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی نے جنم لیا ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے کمیونسٹوں نے مزدور کسان سبھا کی داغ بیل ڈالی، ۱۹۲۷ء میں کانپور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کا اجلاس ہوا اسی اجلاس کے ساتھ ہندوستان میں کارفرما اشتراکی عناصر کی سرگرمیاں کھل کر سامنے آئیں اور ہندوستان کی برطانوی حکومت نے ضرورت محسوس کی کہ بڑھتے ہوئے اشتراکی اثرات کو روکا جائے، ۱۹۲۹ء میں متعدد اشتراکی لیڈر گرفتار کئے گئے جن پر سازش کا الزام تھا۔ اسی الزام کے تحت ان پر میرٹھ میں مقدمہ چلایا گیا ملزمین

میں چند انگریزوں کے علاوہ مشہور اشتراکی لیڈر مسٹر گھاس والا بھی شامل
اسی سال ٹریڈ یونینسٹ کمیونسٹ پارٹی سے علٰحدہ ہو گئے۔ جس
کی بنا پر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی خاصی کمزور پڑ گئی۔ دوسری جنگ
کے آغاز کے بعد ہندوستان میں قومی سیاسی تحریکوں نے بھی پلٹے کھائے
آل انڈیا نیشنل کانگریس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔
جبکہ یورپ میں برطانیہ ایک انتہائی طاقتور اور خطرناک حملہ آور کے مقابل
تھا۔ اور برطانوی قوم زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی، مسلم لیگ
حالات کی نزاکت کو ذمہ دارانہ انداز سے محسوس کر رہی تھی، لیکن کانگریس
ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی، قائد اعظم رحمتہ اللہ علیہ جرمنی کی فتح
کی صورت میں نسلی تعصبات کی بنیاد پر پیش آنے والی سامراجی کارروائیوں
کو بھانپ چکے تھے، گاندھی جی تصویر کا دوسرا رخ دیکھ رہے تھے قائد اعظم
محسوس کر رہے تھے کہ لندن کے زیر نگیں رہ کر ہندوستان آزادی کے لئے
جدوجہد تو کر سکتا تھا، لیکن برلن کے تحت آزادی کا تصور تک ممکن نہ تھا،
گاندھی جی نازیوں کے قومی نشان سواستیکا کے فیضان حاصل کر رہے تھے
اور دھمکیوں کا سہارا لے کر برطانوی حکومت کو مرعوب کر کے عاملانہ
اختیارات فوری طور پر حاصل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ طریق کار اکھنڈ
بھارت کے قیام کے لئے بہر حال موزوں تھا، ادھر یورپ میں چونکہ
روس جرمنی ہی کا طرفدار تھا۔ اس بنا پر ہندوستان کے اشتراکی
حضرات بھی انگریزوں سے کانگریس ہی کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے،

اور کانگریس کے سُر سے اپنا سُر ملائے ہوئے تھے۔ لیکن جیسے ہی جرمنی نے روس پر حملہ کیا اور روس لیگ کے اتحادیوں میں جا شامل ہوا۔ ہندوستان کے اشتراکی حضرات کا زاویۂ نگاہ راتوں رات بدل گیا۔ انہوں نے کانگریس سے آنکھیں چرا کر انگریزوں کی حمایت شروع کر دی، نتیجے کے طور پر انھیں ہندوستان میں تقریر و تحریر کی خاصی مراعات حاصل ہو گئیں جن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان حضرات نے اپنی تحریک کو مستحکم کیا دوسری طرف مزدوروں کی انجمنوں (TRADE UNIONS) کے کئی لیڈر کانگریس کی ہم نوائی کی بنا پر نظر بند تھے اشتراکی حضرات نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان انجمنوں میں رسوخ پیدا کیا، لیکن سیاسی قلابازیوں کی بنا پر اگرچہ اشتراکیوں کو موقع پرست اور ایک بیرونی طاقت (روس) کا آلۂ کار خیال کیا جانے لگا اور وہ عموماً انتہا پسند عناصر کی ہمدردی اور حوصلہ افزائیوں سے محروم ہو گئے تاہم کمیونسٹ پارٹی ایک واضح تحریک کی حیثیت سے ہندوستان کے افق پر ابھر آئی تھی نوجوان طبقہ خصوصاً کالجوں کے طالب علم اور مزدوروں کی انجمنیں ان کی ہم نوا تھیں اور اس پارٹی کی سرگرمیاں دوسری جماعتوں خصوصاً کانگریس اور مسلم لیگ کے لئے کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور اختیار کر گئیں، کیونکہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جو منصوبہ اس پارٹی نے پیش کیا تھا اور عوام الناس سے اس سلسلے میں جو اپیل کی گئی تھی وہ کانگریس اور مسلم لیگ ہی کے مقابلے تھی

" ہماری عظیم سیاسی جماعتیں، کانگریس اور مسلم لیگ جو

عوام پر خاصی دسترس رکھتی ہیں اور جنہوں نے عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا ہے وہ واضح طور پر لا ینحل اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ دونوں جماعتیں آزادی کی باتیں کرتی ہیں۔ دونوں ہی انصاف پسندی کی مدعی ہیں اور دونوں ہی عوام کی ترجمانی کی دعویدار ہیں ایک بیوقوف ہی کہہ سکتا ہے کہ ان جماعتوں کو آزادی کی لگن نہیں ہے یا جو کچھ یہ کہتی ہیں اس میں صداقت نہیں ہے یا یہ عوام کی ترجمانی نہیں کرتیں لیکن اتنا ہی مشاہدہ اگلا قدم اُٹھانے کے لئے کافی نہیں ہے ہماری (کمیونسٹ) پارٹی تیسری اور نوعمر ترین جماعت ہے یہی وہ جماعت ہے جس کو عوام پر حقیقی دسترس حاصل ہے اور جس کے رہنما وہ اصول ہیں جن کی بنا پر اس کو عوام میں موجودہ مقبولیت حاصل ہو سکی ہے اسی جماعت نے اپنی زندگی کے پہلے دن ہی سے برطانوی حکومت کے خلاف ہتھیار اُٹھائے اور اس کے (۴۶) اراکین جیلوں میں حبس دوام کی سزا بھگت رہے ہیں۔"

(فریڈم پروگرام آف انڈین کمیونسٹس از پی سی جوشی ۱۹۴۶ء)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا مقصد کیا تھا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے اس پارٹی نے کونسا منصوبہ پیش کیا تھا؟

الیکشن مینفسٹو

۱۹۴۶ء کے انتخابات کے موقع پر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے انتخابات کے لئے اپنا منشور شایع کیا تھا جو ELECTION MANIFESTO کہلاتا ہے اس منشور کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کے لئے اشتراکی منصوبہ پوری وضاحت سے پیش کیا گیا تھا جو اس منشور سے اخذ کر کے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

(۱) "برطانوی حکومت کی جانب سے آزادی کا اعلان فوراً ہو۔ اختیارات ایک کل ہند آئین ساز اسمبلی

(ALL INDIA CONSTITUENT ASSEMBLY)

کو منتقل کئے جائیں جو معاہدہ انخلائے ہند (QUIT INDIA TREATY) کی شرائط کا مسودہ تیار کرے اور انگریزوں سے مطالبہ کرے کہ اس معاہدہ کو تسلیم کریں یا تمام ہندوستانی عوام کی متحدہ جدوجہد کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔"

(۲) "کل ہند آئین ساز اسمبلی کے اراکین کا انتخاب سترہ قومی یا علاقائی منتخبہ اسمبلیاں کریں گی یہ قومی یا علاقائی اسمبلیاں

موجودہ مصنوعی انداز سے بنائے ہوئے صوبوں کی بجائے (ہندوستان کی) مختلف قومیتوں کے اپنے جغرافائی علاقوں کی بنیاد پر تشکیل پائیں گی یعنی بلوچستان، پٹھانستان، سندھ مغربی پنجاب، ہندوستان، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر کرناٹک، آندھرا، کیرالا، تامل ناڈ، اڑیسہ، بنگال، آسام اور بہار، یہ سترہ قومی علاقائی، اسمبلیاں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تشکیل پائیں گی۔"

(۳) ہندوستانی ریاستوں کے عوام کو حق خودارادی نہ صرف ایک ناقابلِ انتقال حق کے طور پر دیا جائے گا، بلکہ برطانوی حکومت اور اس کے مہروں (راجے مہاراجے اور والیان ریاست) کے خاتمے کے لئے ایک پروگرام ہندوستان کی آزادی کے منصوبے کا لازمی جزو ہو۔"

(۴) مکمل ہند آئین ساز اسمبلی کے اراکین کی حیثیت سفیروں کی سی ہوگی اور مکمل اور حقیقی اقتدار (مجوزہ صوبوں کی) علاقائی اسمبلیوں کو حاصل رہے گا ان کو غیر محدود اختیار حاصل ہوگا کہ مکمل مساوات کی بنیاد پر ایک آزاد ہندوستان میں اپنے (مجوزہ صوبوں ریاستوں یا بھائیوں کے) آپس کے تعلقات کی نوعیت کا تعین آپس میں گفت و شنید کے بعد کر سکیں۔"

(اشتراکی منشور)

پاکستان میں پچھلے دنوں سے جو منصوبہ قومی فلاح و بہبود کے لئے ہمارے سوشلسٹ اور اسلامی سوشلسٹ حضرات پیش کر رہے ہیں، وہ مذکورہ منصوبے ہی کا ایک چربہ ہے۔ سازشی اور مفاد پرست عناصر کا ازل ہی سے وطیرہ رہا ہے کہ قومی یک جہتی اور اتحاد کو پارہ پارہ کر کے لامرکزیت برپا کی جائے اور افراتفری کے عالم میں اپنا الو سیدھا کیا جائے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی مرکزی حیثیت کمزور پڑنے پر انگریز بہادر نے بھی توڑ جوڑ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مرکز سے علیحدگی اور آزادی کے رجحانات کو ہوا دے کر ملک کے ٹکڑے ٹکڑے اڑائے تھے۔ اور پھر ملک کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اشتراکی حضرات نے بھی ہندوستانی عوام کے جذبۂ آزادی کا سہارا لے کر زبان، قومیت اور علاقہ واریت جیسے تعصبات اور تفرقات کو ہوا دینے کی کوشش کی تاکہ آزاد ہندوستان میں ایک مستحکم مرکزیت قائم نہ ہو سکے اور انھیں ملک کے طول و عرض میں اپنی کارروائیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مناسب مواقع حاصل ہو جائیں۔ پاکستان میں بھی ان حضرات نے سابق صدر محمد ایوب خان سے اسی نوع کے مطالبات کئے تھے۔ پاکستان کے تمام تر آئینی مسائل کا حل وہ اپنے طور پر چاہتے تھے۔ فوری طور پر ایوب خان سے استعفیٰ کا مطالبہ، فوری طور پر ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ، علاقہ واریت اور صوبہ واریت کی زور و شور سے حمایت، چھ نکاتی پروگرام، تحریک جئے سندھ، یہ سب کچھ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی ہی کے منصوبۂ آزادی ہند کا ہو بہو چربہ ہے۔
کمیونسٹ پارٹی نے بھی تو یہی چاہا تھا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت

فوری طور پر آزادی کا اعلان کرے، زبان، قومیت اور علاقہ داریت کی بنیاد پر ہندوستان کی "فطری" تقسیم کی جائے اور ان "فطری صوبوں" کی منتخبہ اسمبلیاں مقتدر اعلیٰ قرار دی جائیں اور ان صوبوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ آپس میں اپنے تعلقات کی نوعیت کا فیصلہ کریں، یعنی آزاد رہیں یا ایک وفاقی مرکز کے تحت رہیں۔ اشتراکی منشور میں جا بجا عوام کے علاوہ کانگریس اور مسلم لیگ کو متنبہ کیا گیا کہ انگریز "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر کاربند ہیں، لیکن جو منصوبہ اشتراکی حضرات نے پیش کیا تھا، اس کا مقصد کیا یہ نہیں تھا کہ لڑاؤ اور حکومت حاصل کرو، کیا پاکستان میں وہ اسی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہیں، اسی منشور میں کہا گیا ہے۔

"کمیونسٹ پارٹی سکھوں کو ضمانت دیتی ہے کہ اس علاقہ میں جہاں ان کے تاریخی مقامات ہیں وہ اس علاقہ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ساتھ اپنا حق خود ارادی استعمال کر سکیں گے۔"

(اشتراکی منشور)

یعنی اگر انھیں اس علاقے میں اکثریت حاصل ہوگی تو وہ اپنے صوبہ کے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں گے۔ بنگال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

"کمیونسٹ پارٹی آزاد ہندوستان میں متحدہ اور آزاد بنگال کی حمایت کرتی ہے۔ بنگالی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ وطن کی حیثیت سے بنگال کو ایک مقتدر منتخبہ اسمبلی کے ذریعہ

حق خود ارادی سے استفادہ کا حق حاصل رہے گا۔ جو بالغ
رائے دہی کی بنیاد پر تشکیل پائے گی۔ یہی اسمبلی فیصلہ کرے گی
کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بنگال کا تعلق کیا ہوگا"
(یعنی بنگال آزاد ہوگا یا آزاد وفاقِ ہند میں شامل رہے گا)
(اشتراکی منشور)

ہندوستان کے سترہ آزاد صوبوں یا ریاستوں میں تقسیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی کو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ دوسرے تمام صوبوں یا ریاستوں سے قطع نظر کر کے صرف صوبۂ بنگال کا منشور میں خصوصی تذکرہ کیا جائے، کسی اور ریاست یا صوبے کا منشور میں خصوصی تذکرہ موجود نہیں ہے کیا اشتراکی حضرات بنگال کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے لئے اسے بالکل ہی اور مکمل طور پر ایک آزاد ملک کی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر نے بھی اپنی مخلصانہ سرگرمیوں کا ہندوستان میں اسی انداز سے آغاز کیا تھا۔ پچھلے دنوں مشرقی پاکستان میں جو واقعات چھ نکاتی پروگرام سے غیر ملکی اسلحہ کی ناجائز درآمد، اندرونی فسادات اور بندوق ساز فیکٹری کے زیر زمین وجود کی دریافت تک رونما ہوئے ہیں۔ وہ کسی نئی تحریک کے باعث نہیں بلکہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جس کا نقطۂ آغاز اشتراکی منشور ہے ہندوستان کی سترہ آزاد ریاستوں یا صوبوں میں تقسیم پر منشور نے انتہائی زور دیا ہے، آزاد اس لئے کہ جب ان صوبوں کی اسمبلیاں مقتدر ہوں اور

ہر اسمبلی کو کلی طور پر یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اپنے صوبے کے موقف اور دوسرے صوبوں سے اپنے تعلق کی نوعیت کا تعین کرے، تو یہ صورت قطعی آزادی ہی کہلائے گی، لیکن منشور کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ایک طرف تو اشتراکی حضرات ہندوستان کی سترہ مقتدر اکائیوں میں تقسیم کو ملک کے عوام کے مسائل کا حل سمجھ رہے تھے تو دوسری طرف انگریزوں کو ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور عوام کو بھی ملک کی اس تقسیم کے خلاف اکسایا جا رہا تھا۔

"کمیونسٹ پارٹی تمام ہندوستانی عوام کو خبردار کرتی ہے کہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا تھا اسی پالیسی کے ذریعہ انہوں نے ہم پر دو سو سال حکومت کی اور اسی پالیسی کے ذریعہ وہ ہم پر کچھ اور عرصہ حکومت کرنے کے خواہاں ہیں" (اشتراکی منشور)

"کیمونسٹ پارٹی کا مطالبہ ہے کہ برطانوی غاصبوں کے انتشار پھیلانے اور ہمیں تفرقات کا نشانہ بنانے سے پہلے ہندوستانی عوام کو ان قدرتی اور موروثی جغرافیائی علاقوں میں جہاں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں پیش نظر رکھتے ہوئے (ملک کو صوبوں میں تقسیم کر کے) اقتدار اعلیٰ سونپا جائے۔"

(اشتراکی منشور)

"عوام کا نہ ہی ایک اندازِ فکر ہے اور نہ ہی وہ افراد کا ایک مجموعہ ہیں وہ اپنے اپنے جغرافیائی علاقوں میں رہتے ہیں جہاں ان کی مادری زبانوں نے پرورش پائی ہے جہاں وہ (مقامی) تغیر و تبدّل کے بعد اپنی زندگی سنوارنے کا اہتمام چاہتے ہیں اور آزادانہ طور زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر کے خواہشمند ہیں۔" (اشتراکی منشور)

"کیمونسٹ پارٹی آزاد ہندوستان میں آزاد علاقوں (FREE HOMELANDS IN FREE INDIA) کے لائحہ عمل کے ذریعہ انتہائی قدرتی حل پیش کرتی ہے جس کے ذریعہ ہندوستان کے باشندوں کو ان کی مرضی کے مطابق آزادانہ طور پر نشوونما پانے کے مواقع حاصل ہو سکیں گے۔ کیمونسٹ پارٹی ہر ہندوستانی کو آزاد ہندوستان میں آزاد ریاستوں ..... (FREE HOMELANDS IN FREE INDIA) کا تصور پیش کرتی ہے۔" (اشتراکی منشور)

مذکورہ اقتباسات کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ منصوبہ سراسر فریب تھا اور اشتراکیوں کی آزادیٔ ہند کا منصوبہ صرف ایک اشتراکی

ہندوستان کو جنم دینے کا منصوبہ تھا۔

"کمیونسٹ پارٹی عوام الناس کو وہی کچھ واپس دلانا چاہتی ہے جو ان کا تھا اور انہیں کا ہونا چاہیئے یعنی اپنے HOMELANDS میں اقتدارِ اعلیٰ کا حق"۔
(اشتراکی منشور)

"ہم کمیونسٹ کہتے ہیں۔ ہمیں اس ہندوستان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو انگریزوں کے قبضے سے قبل تھا ان خطوط کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جن پر ہم ترقی پذیر تھے سترہ آزاد HOMELANDS کا ہمارا تصور ..... ہمارے عوام الناس کی ترقی کے لیے انتہائی فطری نظریہ اور ہماری تمام دشواریوں کا حل اور ہمارے اختلافات کی بیخ کنی کا واحد ذریعہ ہے، ہندوستان کو تقسیم کرنے کی بجائے یہ نظریہ خوشحال ہندوستان کی تعمیر کے لئے اساس فراہم کرتا ہے"۔
(فریڈم پروگرام آف انڈین کمیونسٹس از پی سی جوشی)

مذکورہ اقتباسات سے حسبِ ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں۔
(۱) انگریز لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور اس طرح

ہندوستان پر مزید کچھ عرصہ حکومت کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) ہندوستانی عوام متحدہ منشور کے الفاظ میں فرد واحد کی طرح ہوکر انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کریں۔

(۳) ہندوستان کو سترہ آزاد اکائیوں یا صوبوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر اکائی کو وفاقی ہندوستان میں اپنے موقف اور مستقبل کا فیصلہ کرنے کا کلّی حق دیا جائے۔

(۴) انگریز ہندوستان کو اس حالت میں چھوڑیں جس حالت میں وہ اس پر قابض ہوئے تھے۔

(۵) سترہ صوبوں میں تقسیم کے ذریعہ ہی سے منتخبہ اسمبلیاں مقتدر ہوں گی خوشحال ہندوستان کی تعمیر ممکن ہوگی۔

کتنی مضحکہ خیز سی باتیں ہیں کہ آزادی کے حصول کے لئے تو عوام الناس فرد واحد کی طرح متحد ہوجائیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر کا آغاز منتشر ہوکر کریں اس سے زیادہ مضحکہ خیز آزاد ہندوستان میں سترہ آزاد صوبوں یا ریاستوں کا نظریہ ہے جب ملک سترہ اکائیوں میں تقسیم ہوگیا تو پھر آزاد ہندوستان کا وجود کہاں رہا۔ اور جب صوبہ واری اسمبلیوں کو اقتدار اعلیٰ سونپ دیا گیا تو کل ہند مرکزی اسمبلی (جو صوبہ واری اسمبلیوں سے منتخبہ اراکین سے تشکیل پائے) کی حیثیت کیا رہ جاتی' اپنے قدرتی وسائل یا جغرافیائی محل وقوع کے پیش نظر متعدد صوبے وفاقی ہندوستان کی تشکیل کرنے یا وفاقی ہندوستان میں شامل ہوجانے کی بجائے آزادی

ہی کو ترجیح دیتے۔ مثلاً بنگال، سندھ، پنجاب، گجرات اور دکن کے صوبے جن کو ساحل سمندر حاصل ہوتا، اس کے علاوہ جب صوبہ واری اسمبلیوں کی تشکیل ہوتی، ملک کی سترہ صوبوں میں تقسیم ہوتی اور علاقہ واریت اور ذیلی قومیتوں کی بنیاد پر انتخابات ہوتے تو علاقہ واریت اور صوبہ داریت کو اس قدر تقویت حاصل ہو جاتی کہ یہ بعید از قیاس ہے کہ ہندوستان جیسے پسماندہ ملک کے شعوری طور پر بھی پسماندہ عوام آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے علاقہ وارانہ اور اسی نوع کے دوسرے تعصبات سے بلند ہو کر ایک وفاقی ہندوستان کی تشکیل کرتے۔ آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں جو تحریکیں اٹھتی رہی ہیں اس خوش فہمی کا ازالہ کر دیتی ہیں، آزادی کا جنون اس قدر دیکھنے میں آیا ہے کہ صوبہ سرحد نہ جغرافیائی اعتبار سے اور نہ قدرتی وسائل کے اعتبار سے اس موقف میں ہے کہ آزاد ملک کی حیثیت سے باعزت طور پر زندہ ہی رہ سکے لیکن خان عبدالغفار خان جو تقسیم ہند سے قبل تک وہاں بے پناہ اثر رکھتے تھے۔ پختونستان کی رٹ لگائے ہوئے ہیں، کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پٹھانستان کا اشتراکیوں کی جانب سے مجوزہ صوبہ وفاقی ہندوستان میں شامل ہوتا، بلوچستان کا علاقہ قدرتی وسائل سے اس قدر مالا مال نہیں ہے لیکن ساحل سمندر کی بنا پر پٹھانستان ہی کی تقلید کرتا، پھر بلوچستان میں تقسیم ہند سے پہلے بھی ایسے عناصر موجود تھے جو بلوچستان کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے ہندوستان میں سکھوں سے یہ کیونکر توقع کی جا سکتی تھی کہ حق خودارادی

ملنے پر وہ وفاقی ہندوستان میں شامل ہوتے، اور جب کل ہند مرکزی اسمبلی ہی میں ان اراکین کی اکثریت ہوتی جو اپنے اپنے علاقوں کی آزادی کے خواہاں ہوتے تو پھر دو چار صوبے اگر مل کر ایک وفاق کی تشکیل چاہتے تو نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا؟ اور ٹکڑے اڑ کر ہندوستان کا کیا حشر ہوتا، اور جن ریاستوں میں اشتراکی اپنے پرانے ہتھکنڈوں سے برسر اقتدار آجاتے، ایک آزاد وفاقی ہندوستان کے لئے ان کی پر خلوص جد و جہد کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ گذشتہ کئی سال سے کیرالا اسٹیٹ ہندوستان کا صوبہ ہونے کے باوجود اشتراکی اثرات کے تحت ہندوستان کے مقابلے چین کے موقف کی تائید کرتی آئی ہے۔ سترہ ریاستوں میں منقسم ہندوستان میں اشتراکیوں کے برسر اقتدار آنے کے امکانات اس لئے روشن تھے کہ اکثر ممالک بلکہ تقریباً سارے ہی اشتراکی ممالک میں حکومت کے حصول کی جد و جہد میں انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اشتراکی ظاہر نہیں کیا بلکہ مقامی حالات کے پیش نظر انہوں نے وہی لبادہ اوڑھا جو کامیابی کے لئے زیادہ سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتا تھا اور کامیاب ہو کر قدم جماتے ہی وہ لبادہ اتار پھینکا اور اپنے اصلی روپ کو پیش کیا، عوام کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب وہ بے بس کر دیئے گئے اور ان فریب کاروں سے انتقام لینے کی کوئی صورت نہیں رہی، ہندوستان کو اس حالت میں چھوڑنے کا مطالبہ جس حالت میں ہندوستان انگریزوں کے برسر اقتدار آنے سے پہلے تھا، اس بنا پر لغو اور بے معنی ہے کہ ان دنوں

جو جا بہ جا خود مختار ریاستیں ہندوستان میں موجود تھیں وہ عوام کی مرضی سے قائم نہیں ہوئی تھیں اور نہ ان کی حکومتیں عوام کی نمائندہ حکومتیں ہی تھیں لیکن اس مطالبہ سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی روس کی طرح ہندوستان میں بھی اس ملک کے وسیع و عریض اور مختلف قوموں اور فرقوں کا وطن ہونے کی بنا پر ایسے حالات چاہتی تھی جن سے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کماحقہ استفادہ کیا جا سکتا تھا ۔

اختراعاتِ گوناں گوں

جہاں تک ہندوستان کی برطانوی حکومت کے اس ارادے کا تعلق ہے کہ وہ لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان پر کچھ عرصہ اور قبضہ رکھنا چاہتی تھی ، یہ ایک محض افسانہ تھا ۔ اشتراکی منشور کی اشاعت کے ایک سال بعد ہی برطانوی حکومت نے اقتدار ہندوستانی عوام کو ان کی مرضی کے مطابق منتقل کر دیا تھا ۔ جس کا سہرا کمیونسٹ پارٹی کے نہیں بلکہ مسلم لیگ اور کانگریس کے سر ہے ، لیکن کمیونسٹ پارٹی نے عوام کو مرعوب کرنے کی غرض سے ایک ہوّا تیار کیا تھا بالکل اسی طرح جس طرح ہندوستان نے اسلحہ سمیٹنے کے لئے دنیا کے سامنے چین کو ایک ہوّا بنا رکھا ہے یہ تو اشتراکی حضرات الاپتے ہی رہے تھے کہ " لڑاؤ اور حکومت کرو " کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انگریز کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی کو بیوقوف بنا کر ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دے رہے تھے تاکہ وہ

ہندوستان پر کچھ اور عرصہ حکومت کر سکیں:

"آج ہندوستان کے لیڈر ماضی کے تلخ تجربات کو بھول رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں اور وہ اس چال کو سمجھنے سے قاصر ہیں جو سامراجی اپنی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کو کامیاب بنانے کی غرض سے چل رہے ہیں، ہمارے بزرگوں نے اس چال کو سمجھنے میں ناکام ہو کر اور برطانوی حملہ آوروں کو ہمارے تفرقات سے فایدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کر کے اپنے وطن کو کھو دیا تھا۔ موجودہ لیڈر بھی وہی غلطی کر رہے ہیں انتخاب کنندگان (عوام) کے اجتماعات میں کانگریس یا مسلم لیگ کے بہترین اور سربرآوردہ قائدین مثلاً ایک جانب قاید اعظم" اور دوسری جانب پنڈت نہرو کی تقاریر سننا ہی کافی ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ عوام سے ان کی اپیل صرف اس قدر ہے کہ وہ (عوام) ان پر بھروسہ کریں اور انھیں کامیاب بنائیں باقی سب کچھ وہ خود کر لیں گے وہ صرف اعتماد کا ووٹ مانگتے ہیں اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں وہ اس منحوس سوال کا رسمی جواب تک نہیں دیتے کہ اتنا عرصہ گذرنے کے باوجود وہ اپنا مقصد جاننے میں ناکام کیوں رہے ہیں جب کہ انھیں عوام کا غیر مشروط اور مکمل اعتماد حاصل رہا ہے؟ آج ان کی تقاریر میں برطانوی چال یا برطانوی مقاصد

کے متعلق کچھ نہیں ہوتا، اسولئے اس کے برطانوی حکومت کا خاتمہ قریب ہے اور برطانیہ کو انھیں سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔"

"یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ غلام ہندوستان کے قایدین کی اولین توجہات ہمیں آج بھی غلام بنائے رکھنے کی برطانوی سامراجی پالیسی پر مرکوز ہوں گی اور وہ آزادیٔ ہند کے مجاہدین کو مضبوط بنانے کی غرض سے انتہائی زحمت گوارا کر رہے ہونگے لیکن یہی تو ہے جو نہ کانگریس کر رہی ہے اور نہ لیگ۔"

(فریڈم پروگرام آف انڈین کیمونسٹس از پی سی جوشی)

مذکورہ کتاب ہی میں پروفیسر ارچی نالڈ کیپ لینڈ کی تصنیف (دی کانسٹیٹیوشنل پرابلمس آف انڈیا) کے علاوہ انگلستان اور ہندوستان کی اہم شخصیتوں کی تقاریر اور بیانات کے علاوہ تجاویز کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ

"خود کو محفوظ اور ہندوستان پر مختار رکھنے کی غرض سے انہوں (انگریز حکمراں) نے اعلان کیا ہے کہ دستور ساز ادارے میں والیان ریاست کو نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے ان پر کوئی دستور ٹھونسا نہیں جا سکتا، اور جب تک وہ خود نہ چاہیں ان کا موجودہ موقف تبدیل نہیں کیا جا سکتا، تمام اعلانات کے ذریعہ جو برطانیہ کی قدامت پسند یا

لیبر گورنمنٹ کی جانب سے کئے گئے اس بات پر زور دیا گیا ہے
کہ والیان ریاست کو اپنی اپنی رعایا پر مکمل تسلط حاصل
رہنا چاہیئے اور ان کے مقدس حقوق کی نفی نہیں کی جانی
چاہیئے ... ہر ہندوستانی ریاستی ہندوستان کی حالت
جانتا ہے عوام کے لئے ریاستی ہندوستان برطانوی
ہند سے بدتر قید خانہ ہے اور والیانِ ریاست صرف
اپنی پیدائش کی بنا پر ہندوستانی ہیں، ورنہ حقیقتاً وہ برطانیہ
کے پٹھو ہیں اگر ان کے انگریز آقا ان کی حفاظت نہ کریں تو وہ
ایک ہی دن میں اپنی رعیت کے غم و غصہ کا شکار ہو جائیں"۔

مذکورہ کتاب کے مصنف پی سی جوشی نے پروفیسر کپ لینڈ کے حوالے سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ آزادیٔ ہند کی صورت میں تمام والیان ریاست الحاق کر کے ایک طرح کا PRINCESTAN قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں جسے برطانیہ کا تحفظ حاصل رہے گا۔ کپ لینڈ نے صرف ایک امکان پر روشنی ڈالی ہے کہ والیانِ ریاست وفاقی ہندوستان میں شمولیت کی بجائے اپنی ہمار یاستوں کے الحاق کے ذریعہ اپنی ایک علیحدہ وفاقی مملکت تشکیل دے کر برطانیہ سے معاہدہ کر سکتے ہیں، جوشی نے کپ لینڈ کے پیش کئے ہوئے امکان کو برطانیہ کی سیاسی چال اور ہندوستان پر مزید کچھ عرصہ حکومت کر سکنے کا منصوبہ قرار دیتے ہوئے لکھا

" والیانِ ریاست کی وفاقی ہندوستان میں شمولیت کی بجائے

انہی ہی (ریاستوں کے آپس میں الحاق سے تشکیل پائی ہوئی) مملکت برطانیہ سے نہ صرف دفاعی معاہدہ کر سکتی ہے بلکہ اسلحہ سازی اور دوسری صنعتوں کو ترقی دینے امداد بھی طلب کر سکتی ہے اور وہ (پروفیسر کپ لینڈ) کہتا ہے۔

"ہندوستان کے وسط میں، برطانوی ہوابازوں کے تصرف میں ہوائی اڈوں کا ایک گروپ برطانوی دولت مشترکہ کی جنگی ضروریات کے پیش نظر اہم ہوگا"۔ ۔ ۔ ۔ صاف الفاظ میں، ریاستوں میں برطانوی افواج متعین رہیں گی اور برطانوی ہوائی اڈے قائم رہیں گے تاکہ بہ وقت ضرورت ہندوستان ہی میں وہ سامراجی مقاصد کی تکمیل میں ممد ہوں اور شاہی حکومت برطانیہ کو پورے ایشیا پر اپنی سامراجیت مسلط کرنے میں مدد دے سکیں صرف یہی بات نہیں ختم ہو جاتی اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ برطانوی سامراجی سوچتے ہیں کہ، "اگر آزاد عوامی ہندوستان نے برطانوی سرمایہ کو ناپسند کیا یا برطانوی سرمایہ کاری کے لئے غیر موزوں حالات پیدا کئے تو وہ ریاستوں میں اپنا سرمایہ محفوظ کر سکیں گے اور برطانوی صنعتیں قائم کر سکیں گے۔

ریاستی ہندوستان کا ہوا کھڑا کرنے کے لئے ایک جانب پروفیسر کپ لینڈ کا خاص طور پر سہارا لیا گیا تو دوسری جانب کپ لینڈ کی

تصنیف کی اہمیت کو خاص طور پر جتلایا گیا کہ کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ ایک برطانوی مصنف کا جائزہ برطانوی حکومت کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا

"پروفیسر کپ لینڈ نے اگرچہ سات سو صفحات پر مشتمل ایک کتب لکھی ہے جسے وہ حقائق پر مبنی، بامقصد اور سب ہی کچھ قرار دیتا ہے لیکن وہ صرف ایک پروفیسر ہی نہیں ہے اور نہ ہی وہ محض خدائی فوجدار ہے، وہ نوآبادیات سے متعلق ایک اعلیٰ درجہ کا برطانوی دستوری ماہر سمجھا جاتا ہے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں، وہ نوآبادیاتی تاریخ کا پروفیسر ہے اور اسے نیو فیلڈ انڈاومنٹ کے تحت بھیجا گیا تھا کہ وہ علمی جائزے کے بہانے سے ہندوستان کی صورت حال کا مشاہدہ کرے۔۔۔ کرپس مشن میں مشیر کی حیثیت سے اُسے شمولیت کی دعوت دی گئی تھی اور جب لارڈ ویول لنڈن گئے تو کپ لینڈ کو انہیں مشورہ دینے کے لئے طلب بھی کیا گیا تھا۔ برطانوی حکومت کو اس کی خدمات ہر وقت میسر ہیں۔"

"یہی وہ پروفیسر ہے جس نے ۱۹۳۶ء کی فلسطین رپورٹ پیش کی تھی جس کی رو سے ایک جداگانہ عرب ریاست اور ایک جداگانہ اسرائیلی ریاست آزادانہ حیثیتوں کے ساتھ

قیام پذیر ہوئی تھیں اور ان کے درمیان ایک مخروطہ نما علاقہ مستقلاً برطانیہ کے زیر نگیں اس غرض سے تجویز کیا گیا تھا کہ عیسائیوں کے مقدس مقامات کا تحفظ ہو سکے ہندوستان کی تین یا تین سے زیادہ مملکتوں میں تقسیم جو جداگانہ اور مشترکہ طور پر برطانیہ کے زیر نگیں ہوں، ایک خطرناک تصور ہے جو ہندوستان کو درپیش ہے۔

(فریڈم پروگرام آف انڈین کمیونسٹس از پی سی جوشی ۱۹۴۶ء)

اشتراکی منشور کے ذریعہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے کہا

" اُن (برطانوی حکمراں) کا منصوبہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اکثریتی ریاست اور مسلم اکثریتی ریاست میں تقسیم کر دیں اور ان دونوں ریاستوں کے دستور جداگانہ طور پر برطانوی حکومت کے تعاون سے بنائے جائیں، ساتھ ہی ان کا منصوبہ ہے کہ برطانوی حکومت سے والیانِ ریاست کے تعلقات آزادانہ معاہدوں کے ذریعہ بدستور باقی رہیں اس طرح انھیں توقع ہے کہ وہ عام بیداری کی اس عظیم تحریک کو تفرقات کا نشانہ بنا سکیں گے، جس کی قیادت کانگریس اور مسلم لیگ نے کی ہے اور قبضہ بحال رکھیں گے، بالواسطہ اپنے روایاتی پٹھوؤں (والیانِ ریاست)

کے ذریعہ؟

"ہمارے وطن کی مستقل غلامی اور انتشار کے لئے یہ ایک عیارانہ منصوبہ ہے"۔ (کمیونسٹ مینیفسٹو)

ایسا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے کہ مختلف پالیسی پر کاربند کئی جماعتیں ایک ملک میں اور یکساں حالات میں ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے دوش بہ دوش جد و جہد کرتی ہیں اپنی پالیسی کے تحت وہ اسباب و علل، واقعات، اور ان کے نتایج کی توضیحات میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتی ہیں۔ لیکن جب کوئی جماعت اپنے ظاہری مقاصد کی بجائے پس پردہ مقاصد کے پیش نظر کسی واقعہ کے اسباب و علل اور نتایج کی توضیحات کرتی ہے تو ایک چیستان عبارت ہوتا ہے کمیونسٹ پارٹی کی مذکورہ توضیحات اور انگریز کے منصوبے کی دریافت ایک چیستان ہے جس کا مقصد صرف ایک ہوّا کھڑا کرنا تھا، تاکہ عوام کانگریس اور مسلم لیگ سے کنارہ کش ہو جائیں، اس کے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کو عوامی تائید حاصل ہو جاتی، مسلمان پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے اور مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور ہندو آزاد ہندوستان کے قیام کے لئے کانگریس کے ہمنوا تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کانگریس اور مسلم لیگ پر اتحاد کی بنا پر کمیونسٹ پارٹی کے پھلنے پھولنے اور ایک اشتراکی ہندوستان کو جنم دینے کے مواقع کم اور ناقابل اعتنا تھے چنانچہ کمیونسٹ پارٹی نے کانگریس اور لیگ پر عوام کے عمومی اعتماد پر ضرب لگانے اور اپنا راستہ ہموار کرنے کی غرض سے تقسیم ملک کو ایک سامراجی سازش اور ہندوستان پر کچھ عرصہ اور حکومت کرنے کی برطانوی کوشش قرار دیا چونکہ کانگریسی اور لیگی

لیڈروں کو ہندوستان کے عوام خوب جانتے اور پہچانتے تھے۔ اس بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انگریز اس سازش کی تکمیل کے لئے کانگریس یا لیگ کو آلۂ کار بنا رہے تھے۔ چنانچہ والیان ریاست کے سر یہ الزام تھوپا گیا کہ وہ ہندوستان کے عوامی مفادات کے خلاف انگریز سے سازباز میں مصروف تھے اور انگریز انہیں اپنے سامراجی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ والیان ریاست پر یہ الزام چسپاں ہونا بھی تھا کیونکہ والیان ریاست کو نہ ہند کے عوام بخوبی جانتے تھے اور نہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے ان کی وابستگی کچھ واضح تھی چنانچہ پروفیسر کپ لینڈ کے حوالے سے والیان ریاست کے سہارے کمیونسٹ پارٹی نے ایک ہوّا کھڑا کر دیا اور ساتھ ہی کانگریس اور لیگ کو فتویٰ دے دیا کہ باہمی اختلافات کی شدّت نے ان دونوں کو اندھا کر دیا ہے اور یہ اندھے غلامی کی تاریکیوں میں انگریز کی لاٹھی کے سہارے آزادی کا چراغ ٹٹول رہے ہیں اور انگریز دونوں ہی کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے بہترین موقف میں ہے، ممکن تھا کمیونسٹ پارٹی کی موشگافیاں ہندوستان کے سیاسی افق پر کچھ اور بھی رنگ دکھاتیں لیکن ایک سال ہی میں دنیا پر یہ واضح ہو گیا کہ کمیونسٹ پارٹی کی توضیحات مضحکہ خیز نہیں بلکہ ہندوستان کی آزادی کے خلاف ایک سازش تھیں، کہاں تو یہ واویلا کہ انگریز ہندوستان کو تقسیم کر کے اور والیانِ ریاست سے معاہدے کر کے ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارے ایشیا پر سامراجی تسلط جمانے کی فکر میں ہے اور کہاں

یہ کہ ایک سال ہی میں انگریز نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنی راہ لی یہ بھی دنیا دیکھ رہی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کپٹن لینیاٹ جیسے نوآبادیاتی امور کے ماہر کی خدمات سے استفادہ کے باوجود انگریز اس موقف میں نہیں رہا کہ اس سلطنت کو سنبھال سکے جس میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور دھیرے دھیرے انگریز نہ صرف اپنی نوآبادیات سے دست کش ہو چلا ہے بلکہ وہ نوآبادیات کے سلسلے میں بے حد محتاط بھی ہو گیا ہے اس قدر محتاط کہ جب ہندوستان نے گوا اور دوسرے پرتگالی مقبوضات پر حملہ کیا اور اس حملے کے خلاف فوجی کارروائی کی غرض سے پرتگال نے جب انگلستان سے درخواست کی کہ اسے مشرقِ وسطیٰ میں برطانوی ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو انگلستان نے سُنی ان سُنی کر دی، دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ حصول آزادی کے بعد ہندوستان کے کانگریسی لیڈروں نے آخری برطانوی گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کو آزاد ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر اپنے مفادات کا بہترین تحفظ کیا۔ دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان نے برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہو کر کوئی نقصان نہیں اٹھایا۔ اور نہ ایشیا کے عوام کو ہندوستان کی تقسیم اور دونوں ممالک کی برطانوی دولتِ مشترکہ میں شرکت سے کوئی نقصان پہنچا اور یہ بھی دنیا نے دیکھا کہ والیانِ ریاست کو حقِ خود ارادی دے کر (یعنی اگر وہ چاہیں تو ہندوستان پاکستان میں شامل ہو جائیں ورنہ آزاد رہیں) انگریز انھیں کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ گئے، راجستھان

کی بعض ریاستوں کو طوعاً و کرہاً ہندوستان کی حکومت نے انڈیا یونین میں شمولیت پر مجبور کیا، منادادر، مانگرول اور جوناگڑھ ان تینوں ریاستوں نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تو ہندوستان نے فوجی کارروائی کے ذریعہ ان کو ہڑپ کرلیا۔ اور برطانیہ نے کوئی مداخلت نہیں کی جس عالم بے کسی میں انگریز والیان ریاست کو چھوڑ گئے تھے اس کا اندازہ نواب مشتاق احمد خان صاحب کے ایک مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے جو ریاست حیدرآباد دکن کے سقوط سے متعلق ہے' حیدرآباد کی حیثیت برطانوی ہند کی ایک ریاست کی سی نہیں تھی، یہ ایک سلطنت تھی جس کا رقبہ ہندوستان کے متعدد صوبوں سے زیادہ تھا، اس کی آبادی دو کروڑ کے لگ بھگ تھی اس کا فرمانروا برطانیہ کو ہر آڑے وقت بے دریغ مدد دیتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم میں نظام دکن نے برطانیہ کو اتنا کچھ دیا تھا کہ اعتراف کے طور پر برطانیہ کے رائل ایر فورس کے ایک بہترین اسکواڈرن کو حیدرآباد اسکواڈرن کا نام دیا گیا اور برلن پر پہلی کارگر بمباری اسی اسکواڈرن نے کی تھی، دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر نظام الملک آصف جاہ سابع کو "رائل وکٹورین چین" سے نواز کر شہنشاہ انگلستان نے ان سے اپنے اور اپنے خاندان کے قریبی تعلقات کا اظہار کیا تھا۔ نظام کو تاج برطانیہ کی جانب سے خصوصی مراعات اور مراتب حاصل تھے انہیں برطانیہ نے "ہز اگزالٹیڈ ہائی نس" اور "فیتھ فل ایلائی آف دی برٹش" (یار وفادار برطانیہ) کے علاوہ دوسرے

.... خطابات سے نواز کر ان کا مرتبہ ہندوستان کے والیان ریاست کے مقابلے کہیں بلند کر دیا گیا تھا، نواب مشتاق احمد صاحب لکھتے ہیں:

"حیدر آباد اور برطانیہ کے سیاسی تعلقات چند معاہدوں کی بنا پر استوار ہوئے تھے ان کی روشنی میں نظام یہ سمجھنے اور باور کرنے میں حق بجانب تھے کہ انگریزوں کے جانے کے بعد وہ سب معاہدے کالعدم ہو جائیں گے اور وہ تمام پابندیاں جو ان کے مفروضہ اقتدار اعلیٰ نے جبراً عائد کی تھیں خود بخود ختم ہو جائیں گی وہ تمام علاقے جو نظام سے زبردستی حاصل کئے گئے اور جن میں بھیلی بندر بھی شامل تھا، واپس کر دیئے جائیں گے اور اگر وہ (نظام) چاہیں تو براہ راست دولت مشترکہ سے اپنے تعلقات استوار کر سکیں گے.... ۹ راگست ۱۹۴۷ء کو نظام نے (آزاد ہندوستان کے ہونے والے اور برطانوی ہند کے آخری گورنر جنرل) لارڈ مونٹ بیٹن کے نام ایک تاریخی خط میں وہ معاہدے اور وعدے یاد دلائے جو وقتاً فوقتاً ان سے کئے گئے تھے، لارڈ مونٹ بیٹن وعدے کرتے رہے مگر نظام کی تحریر حکومت برطانیہ کو نہ بھیجی...... سر آرتھر لوتھین (SIR ARTHUR LOTHIAN) نے حیدر آباد کے آخری برطانوی ریذیڈنٹ تھے یوں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

"اٹارنی جنرل اور وزیر ہند کے بیانات جن میں ملک معظم

(جارج ششم) کی حکومت نے ریاستوں کو شرکت کرنے پر مجبور نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے حیدرآباد کے خلاف ہندوستان کی معاشی ناکہ بندی کی روشنی میں عجیب و غریب نظر آتے ہیں کاش میں اُن الزامات کو سننے کے لئے زندہ نہ رہتا جو ۱۵؍ اپریل ۱۹۴۸ء کے خط میں نظام نے ہم پر اور ہماری حکومت پر لگائے ہیں"۔ ۱۵؍اپریل ۱۹۴۸ء کے جس خط کا سر آرتھر لوتھین نے ذکر کیا ہے وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام لکھا گیا تھا، اس کے آخری فقروں میں جو چبھن اور طنز ہے افسوس ہے کہ اس نے بھی حکومت برطانیہ کے سیاسی ضمیر کو نہیں جھنجھوڑا "گذشتہ سال مجھ سے استمزاج کئے بغیر سارے عہد ناموں کو یک طرفہ منسوخ کر دیا اور جو رشتہ ملک معظم (جارج ششم) کی حکومت اور حیدرآباد میں قائم تھا توڑ دیا گیا فضیلت مآب نمائندہ تاج اب میرے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے کریں گے، یہ ضرور ہے کہ کمزور سے کئے ہوئے وعدے پورے کرنے میں کوئی ایسا فوری فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو طاقتور سے وعدوں کی تکمیل میں ہوتا ہے، لیکن بالآخر فطرت اپنا انتقام لے لیتی ہے"۔

جون ۱۹۴۸ء میں... سر والٹر مانکٹن جو مفاہمتی دور میں حیدرآبادی وفد کے دستوری مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ بالآخر مایوس ہو کر انگلستان واپس چلے گئے، ماہ اگست میں یہ

بات قریب قریب یقینی ہو گئی کہ ستمبر کے تیسرے ہفتے میں ہندوستان
فوجی طاقت استعمال کرے گا۔ اس خبر کی بالواسطہ تصدیق حیدرآبادی
فوج کے ایک انگریز بریگیڈیر کے استعفا پیش کرنے سے ہو گئی جو
اس نے اپنی حکومت کے ایما سے دیا تھا، اس کی تقلید میں چند اور
اینگلو انڈین جونیئر افسروں نے بھی نے بھی استعفا دے دیئے اس کا
مطلب ظاہر تھا کہ برطانیہ کی حکومت اپنے "یار وفادار" کو بالواسطہ
یا بلاواسطہ کوئی مدد دینا نہیں چاہتی۔ ۔ ۔حملے کی خبر ملتے ہی نظام
نے جو برطانیہ کے بارے میں ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا تھے میرے
واسطے سے وزیر اعظم اٹیلی کو ایک تار بھیجا جس کی نقل شاہ
انگلستان کو بھی دی گئی۔ اس تار میں سوال کیا گیا تھا" کیا برطانیہ
اب بھی اپنی اخلاقی ذمہ داریاں محسوس نہیں کرے گا"؟ جب اس
پیغام کی ۱۵ ستمبر تک رسید نہ ملی تو وزیر اعظم اٹیلی کو ایک
اور پیغام بھیجا گیا اس تار کی نقل شاہ انگلستان کو بھیجتے ہوئے
اس میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا "کیا یور میجسٹی اپنے یار وفادار
کو اس طرح ہندوستان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے"۔۔۔اس
کی رسید بھی نہ ملی"۔

(سقوطِ حیدرآباد از نواب مشتاق احمد خاں سابق ایجنٹ
جنرل حیدرآباد متعینہ پاکستان)

جن معاہدوں کا مذکورہ اقتباسات میں بار بار ذکر آیا ہے وہ حیدرآباد

میں برطانوی ہوائی اڈّوں کی تعمیر یا انگریزوں کو سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کرنے سے متعلق نہیں تھے۔ بلکہ ان معاہدوں کے ذریعہ حکومت برطانیہ نے آصفجاہ سابع میر عثمان علی خاں نظام دکن کے بیشتر وسلاطین سے سلطنت حیدرآباد کے علاقے اپنے قبضے میں کئے تھے۔ اگر ان معاہدوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے برار کی طرح دوسرے علاقے بھی نظام کو واپس کر دیئے جاتے تو وسطی اور جنوبی دکن کا ساحل سمندر تک خاصا بڑا حصہ نظام کو مل جاتا اور سلطنت کا رقبہ تقریباً دوگنا ہو جاتا کیمونسٹ پارٹی نے عوام کو سمجھایا تھا کہ اپنے پٹھوؤں یعنی والیانِ ریاست کے ذریعہ انگریز آزاد ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے مفادات کو نقصان پہنچائیں گے اور تخریبی کارروائیوں کے ذریعے اپنا تسلط قائم رکھیں گے جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ برطانوی حکومت نے کم از کم ہندوستان کو پورا پورا موقعہ دیا کہ وہ ساری ریاستوں کو ہڑپ کر جائے اور ان معاہدوں کو یکطرفہ منسوخ کر دیا گیا جو والیان ریاست کے تاج برطانیہ سے صدیوں سے قائم تھے کیمونسٹ پارٹی نے ہوا ضرور تیار کیا تھا لیکن اسے مشکل سے سال بھر کی مہلت ملی جو انتہائی ناکافی تھی وہ عوام کے ذہن کو متاثر نہ کر سکے اور تقسیم ہند کے ساتھ ہی ان کی شاطرانہ چالیں بیکار ہو گئیں۔

خوش آیند وعدے

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی

نے بڑے منطقی انداز میں عوامی ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی، ہندوستان کی آزادی اور سترہ آزاد علاقوں یا ریاستوں میں تقسیم کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کانگریس کے ہندوؤں پر اور مسلم لیگ کے مسلمانوں پر یکساں اثر سے بھی استفادہ کی بڑی ہی ترغیبی کوشش کی گئی۔ چنانچہ منشور میں کہا گیا۔

" مسلم لیگ کو آزادی ہوگی کہ مسلم اکثریتی علاقوں کا ایک جداگانہ اور آزاد وفاق قائم کرے جو ایسے ہی (متوازی) ہندو اکثریتی علاقوں کے دوسرے جداگانہ اور آزاد وفاق سے دوستانہ تعلقات رکھے اور جو متحدہ ہندوستان کے تحت نہ ہو، کانگریس کو آزادی ہوگی کہ وہ متحدہ وفاقی ہندوستان کے لئے جدوجہد کرے ... ہماری (کمیونسٹ) پارٹی کو آزادی ہوگی کہ قومی ریاستوں کا ایک آزاد وفاق کریں (یا رضاکارانہ اتحاد قائم کریں) جس کے تحت ان ریاستوں میں داخلی طور پر مکمل جمہوریت ہوگی اور خارجی طور پر ایک وفاقی مرکز کے ذریعہ زیادہ ترقی یافتہ ریاستیں پسماندہ ریاستوں کی مدد کریں گی۔"

سترہ آزاد قومی صوبوں یا ریاستوں میں منقسم متحدہ ہندوستان میں انگریزوں سے آزادی اور اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے بعد مسلم اکثریتی علاقوں کا ایسا وفاق قائم کرنے کے لئے کام کرنے کی اجازت، جو آزاد متحدہ یا وفاقی ہندوستان کے تحت ہونے کی بجائے اپنی آزادانہ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہو اور ہندو اکثریتی علاقوں کے ایسے ہی وفاق سے برابری پر دوستانہ تعلقات رکھتا ہو، دراصل پاکستان

کی تحریک کی حمایت ہے۔ یعنی اگر مسلمان اپنے اکثریتی علاقوں یا ان قومی ریاستوں کو جن میں ان کی اکثریت ہو متحد کرکے آزاد پاکستان قائم کرنا چاہیں تو انہیں کوئی نہیں روکے گا۔ اس طرح کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کے متوالے مسلمانوں کو سبز باغ دکھلایا تھا۔ پاکستان یا ہندواستھان کے لئے پہلے ہندوستان کی سترہ آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم ہی کیوں ضروری تھی اور کمیونسٹ پارٹی کو انگریزوں ہی کے ہاتھوں پاکستان کے مطالبے کی تکمیل کیوں منظور نہ تھی جب مسلم لیگ مسلم اکثریتی علاقوں کے الحاق ہی سے پاکستان کی تشکیل چاہتی تھی اور کسی ایسے علاقے کا مطالبہ نہیں کر رہی تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت نہ تھی اور نہ انگریز اسے ایسا کوئی علاقہ سونپ رہے تھے، ان سوالوں کا جواب صرف یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی نہیں چاہتی تھی کہ پاکستان تشکیل پائے، برطانوی ہند میں ایک علیٰحدہ اسلامی مملکت کے قیام کی تحریک تو چلائی جا سکتی تھی اور اس کی حق بجانبیت کی بنا پر یہ تحریک کامیاب بھی ہو سکتی تھی کیوں کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں جو اگرچہ برطانوی تھی، ایسے متعصب عناصر نہیں تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کو کانگریس یا کمیونسٹ پارٹی کے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرتے لیکن ایک ایسا وفاقی ہندوستان میں جو سترہ آزاد قومی ریاستوں پر مشتمل ہوتا اور جن کی وفاقی حکومت کا دارومدار ایسی اسمبلی پر ہوتا جس کے ارکین کو ان سترہ قومی ریاستوں کی اسمبلیاں منتخب کرتیں، پاکستان جیسے ملک کے قیام کی کوشش کس قدر مضحکہ خیز ہوتی، مسلمانوں کے اکثریتی صوبے تھے ہی کتنے اور ان صوبوں میں مسلمانوں کا موقف کیا تھا۔ پنجاب میں . . . . . مسلمانوں کا تناسب

(۵۷) فیصدی تھا، اور پراونشیل اسمبلی میں ان کی نشستیں (۴۹) فیصدی
تھیں بنگال میں مسلمان (۵۵) فیصدی تھے اور نشستیں (۴۸) فیصدی تھیں۔
سندھ میں مسلمان (۷۱) فیصدی تھے اور نشستیں (۵۷) فیصدی تھیں صوبہ سرحد میں
مسلمان (۹۲) فیصدی تھے اور نشستیں (۷۲) فیصدی تھیں بلوچستان میں مسلمان
(۸۷) فیصدی تھے لیکن اس صوبے کی اسمبلی ہی نہیں تھی، بلوچستان میں (۸۷)
آبادی مسلمان ہونے کے باوجود عالم یہ تھا کہ جولائی ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم کوئٹہ
تشریف لے گئے تو بلوچستان پراونشیل مسلم لیگ نے ان کی قیادت پر مکمل اعتماد
کا اظہار کرتے ہوئے، ایک قرارداد کے ذریعہ ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس
کا مقصد پاکستان کے مجوزہ ڈھانچے میں صوبہ سندھ، صوبہ پنجاب اور
صوبہ سرحد کے ساتھ صوبہ بلوچستان کے الحاق کی صورت میں بلوچستان کے لئے
ایک علیحدہ صوبہ کی حیثیت کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ بنگال میں مسلمان
(۵۷) فیصدی تھے لیکن وہاں عالم یہ تھا کہ بنگال پراونشیل مسلم لیگ نے گاندھی
جناح ملاقات سے قبل ایک قرارداد کے ذریعہ متحدہ بنگال کی حمایت کی تھی، جہاں
کے باشندوں کو حق خودارادی حاصل ہوتا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی
ایک ملک میں شمولیت یا مکمل طور پر ایک آزاد ملک کی حیثیت اختیار کرنے کا فیصلہ
کر سکیں، صوبہ سرحد میں پٹھانوں نے ان دنوں کانگریس سے رشتہ جوڑ رکھا تھا"
ریاست کشمیر میں (۸۲) فیصدی آبادی مسلمان تھی، لیکن ان کے قائد شیخ عبداللہ
کشمیریوں کے لئے حق خودارادی کا مطالبہ رکھتے ہوئے بھی کانگریس کے
دسترخوان پر منڈلا رہے تھے ان مسلم اکثریتی صوبوں میں داخلی طور پر ان کی کمی

آزادی کے بعد ان کے ایک آزاد متحدہ وفاق کی تشکیل کا کام کس قدر دشوار ہو جاتا اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم ترجمان مسٹر جوشی نے ابھی صورتِ حال کے پیش نظر لکھا اور خود ہی پاکستان کے قیام کے امکانات کی تردید کر دی:

"موجودہ حدود اور اعداد و شمار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ لیگ نے بنگال اور پنجاب میں تمام مسلم نشستوں پر قبضہ کر لیا ہے تاہم وہ علیٰحدگی کے لئے ووٹ حاصل نہ کر سکے گی کیونکہ مسلمانوں کی نشستیں کل نشستوں کے مقابلے پچاس فیصدی سے کم ہیں۔"

اس صورتِ حال کے پیش نظر ہندوستان کی آزادی کے کمیونسٹ منصوبے کے تحت آزاد قومی ریاستوں میں ایک طرف تو مکمل داخلی آزادی اور حق خود ارادیت کے حصول کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں پاکستان کے قیام کا جذبہ خاصی حد تک سرد پڑ جاتا اور وہ علاقہ واریت کی سطح سے بلند ہو کر ایک وفاقی اسلامی مملکت کے قیام جیسے عظیم مقصد کی حمایت کرنے کی بجائے علاقہ واریت اور اسی نوع کے تعصبات کا شکار ہو کر رہ جاتے اور پاکستان کا قیام ناممکن ہو جاتا۔ تو دوسری جانب آزاد قومی ریاستوں میں جو اسمبلیاں قائم ہوتیں ان میں پاکستان کے قیام کے لئے لیگ کو کافی نمائندگی شاید ہی کہیں نصیب ہوتی، تو تیسری جانب ان اسمبلیوں کے اراکین کی منتخب کی ہوئی آل انڈیا آئین ساز اسمبلی میں اسی بنا پر ہندو اور غیر مسلم کثیر اکثریت میں

ہوتے کہ غیر مسلم اراکین کی تعداد مسلمان اراکین کی تعداد . . . .
سے نگنی ہوتی، غیر مسلم آپس میں کتنے ہی الجھیں، جہاں مسلمانوں کا کوئی سلسلہ
درپیش ہوا سب ہی متحد ہوتے آئے ہیں جب کہ ان نازک موقعوں پر بھی مسلمان
اپنے اختلافات کو فراموش نہ کر سکے، چنانچہ ہندوستان کی کل ہند نمائندہ
اسمبلی میں پاکستان کی تحریک کو غیر مسلموں کے علاوہ کچھ مسلمان نمائندوں کی
بھی تائید حاصل نہ ہوتی اور کثرت آراکی تائید سے اس تحریک کو بڑی آسانی
سے کچل دیا جاتا۔ ان قیاسات کو اس حقیقت سے اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے
کہ تقسیم ہند کے موقعہ پر مرکزی برطانوی حکومتِ ہند کے سربراہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن
کے کانگریس کی طرف جھک جانے سے برصغیر کے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچا کہ
تلافی آج تک نہ ہو سکی اور مسلمان اس چوٹ کو آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ اس
وقت جب کہ تقسیم ملک کا فیصلہ ماؤنٹ بیٹن کے اختیار سے باہر تھا اور انہیں صرف
اس فیصلے کا اطلاق کرنا تھا، ان کی جانب داری مسلمانوں اور پاکستان کو ناقابلِ
تلافی نقصان پہنچا گئی تو ایک (۷۵) فیصدی غیر مسلم ہندوستان کی اس تناسب
سے نمائندہ وفاقی حکومت اور وفاقی اسمبلی سے کیوں کر انصاف کی توقع کی جاتی
جب کہ فیصلہ بھی اسی کا اختیاری ہوتا، اسی بنا پر قائد اعظم نے فرمایا تھا۔

THE COMMUNISTS THINK WE ARE FOOLS. THERE IS SOME JUSTIFICATION IN THEIR THINKING ...BUT NOW THE COMMUNISTS WILL NOT SUCCEED IN

FOOLING US. HANDS OFF HANDS OFF I SAY, COMMUNISTS, HAND OFF. IF YOU TRY THE SAME GAME IT WILL HIT BACK LIKE A BOOMERANG. WE DO NOT WANT ANY ISMS, SOCIALISM COMMUNISM OR NATIONAL SOCIALISMS.

"اشتراکی سمجھتے ہیں کہ ہم بے وقوف ہیں اس اندازِ فکر میں کچھ حق بجانبیت ہے لیکن ... اب ... اشتراکی ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے، خبردار، خبردار، میں کہتا ہوں اے اشتراکیو! خبردار ہو جاؤ اگر تم نے پھر وہ کھیل رچانے کی کوشش کی تو یہ آپ ہی ... تم کو لے ڈوبے گا ... ہمیں کسی ازم، سوشلزم، کمیونزم یا نیشنل سوشلزم کی ضرورت نہیں ہے" (۱۹ر مارچ ۱۹۴۴ء)

چنانچہ منشور میں جو مسلم لیگ کہا گیا کہ اسے پاکستان کے قیام کی کوشش کے مواقع حاصل رہیں گے محض ایک سبز باغ تھا، کانگریس کو اس کے مقابلے جو ایک ہندو اسٹیٹ کے قیام کی کوشش کی آزادی دی گئی وہ ایک فریب اس لئے تھا کہ ایسا ہندوستان ان حالات کے پیش نظر وجود میں نہیں آسکتا تھا سکھ سکھستان کے لئے پٹھان پٹھانستان کے لئے اور پست کردہ اقوام ...

(UNTOUCHABLES) جو مسلمانوں کے خوف اور بے چارگی کے
عالم میں کانگریس کے ساتھ رہے ہیں اور زبان، قومیت اور فرقہ بندی کی بنیاد
پر ہندوستان کی جنوبی قومی ریاستیں شمالی ریاستوں سے علٰحدہ ہو جائیں
اور کانگریس کا خواب نامکمل ہی رہ جاتا۔ ہندوستان مختلف زبانوں، اور
متعدد بلکہ متضاد معاشرتوں اور عقائد کا ملک ہے اور اشتراکی حضرات کو ابتدا
ہی سے اندازہ رہا ہے کہ ہندوستان کے جذباتی باشندوں کو زبان، معاشرت،
اور عقیدے کے نام پر خوب بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے
گذشتہ دس سال کے حالات اور پاکستان کی موجودہ صورت حال اس
کی شاہد ہے۔ اپنی زبان اور اپنی معاشرت اپنے عقیدے اور علاقہ داری روایات
سے جذباتی وابستگی کی بنا پر ہندوستان کے باشندوں کے لئے "سولہ قومی
ریاستوں میں منقسم ہونے کے بعد متحدہ ہندوستان یا پاکستان کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
قیام میں دلچسپی باقی ہی نہ رہتی اور اکثر ریاستیں حق خود ارادی سے فائدہ
اُٹھاتے ہوئے آزادی اختیار کر لیتیں، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہاتھ ملتے
رہ جاتیں اس صورت حال میں کمیونسٹ پارٹی کا ارادہ تھا کہ "سولہ قومی
ریاستوں کا رضاکارانہ اتحاد قائم کرے۔ جس کے تحت ان ریاستوں میں
داخلی طور پر جمہوریت ہوتی اور خارجی طور پر ایک وفاقی مرکز کے ذریعہ
زیادہ ترقی یافتہ ریاستیں کم ترقی یافتہ ریاستوں کی مدد کرتیں" یہاں اس
حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ان قومی ریاستوں میں جا بجا فسادات
پھوٹ پڑتے، جن کی بنیاد مذہبی عقائد ہوتے، ہندوؤں اور مسلمانوں

کے علاوہ ہندوؤں ہی کے مختلف فرقوں میں آپس میں ٹھن جاتی، ہندو مسلم فسادات تو متعدد ریاستوں میں برپا ہو جاتے اس کے علاوہ کہیں سکھ اور ہندو لڑ پڑتے، کہیں مرہٹے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے علاقے سے غیر مرہٹوں کو بھگانے کی سوچتے۔ کہیں آریائی ہندو دراوڑی ہندو سے بھڑ جاتا اور کہیں دراوڑی ہندو آریائی ہندو کی جان کے در پے ہوتا۔

اشتراکی رُوس کے نقشِ قدم پر

روس میں زار کے زوال اور لینن کے برسرِ اقتدار آنے تک کے درمیانی عرصہ میں کچھ ایسا ہی افرا تفری کا عالم رہا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ روس پر کون حکمران ہے اور ان حالات نے وہاں اشتراکیوں کو توڑ جوڑ، ساز باز، دغا فریب اور تشدد کے ذریعہ برسرِ اقتدار آنے میں مدد دی، عام طور پر ہمارے یہاں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ انقلابِ روس لینن کی قیادت میں اشتراکیوں کا کارنامہ ہے۔ حالانکہ انقلاب روس ان جمہوریت پسندوں کا رہینِ منت تھا جو روس کو زار کی شخصی حکومت اور اس کی لعنتوں سے نجات دلا کر مغربی یورپی ممالک کی طرز کا ایک جمہوری ملک بنانا چاہتے تھے ان سے وہی غلطی سرزد ہوئی تھی جسے پاکستان میں دہرایا جا رہا ہے اسلام پسند حضرات جن میں سیاسی رہنما اور عوام دونوں ہی شامل ہیں یہ سوچ بیٹھے ہیں کہ پاکستان میں سوشلسٹوں کا فقط شور و غل ہی

بہت ہے اور انھیں عوام کی خاطر خواہ حمایت حاصل نہیں ہے' انتخابات ہوں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے گا، اسلامی نظام کے حامیوں کا یہ انداز فکر سراسر غلط ہے' اشتراکی حضرات نے جس ملک کو (ایک دو مستثنیات کے سوا) ہتھیایا' توڑ جوڑ' دھوکہ فریب' مکروریا اور تشدد سے ہتھیایا ہے انہیں وہاں عوامی تائید کبھی حاصل ہی نہیں تھی' وہ بڑے پرامن انداز میں سب ہی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قوم پرستی' وطن پرستی اور مذہب پرستی کے نام پہ آگے بڑھتے ہیں عوام ہی نہیں' خواص بھی ان کے فریب میں آتے رہے ہیں' روس میں بھی یہی کچھ ہوا' اشتراکیوں نے جمہوریت پسندوں کو اپنے مخصوص ہتھ کنڈوں سے شکست دے کر روس پر تسلط حاصل کیا تھا' یہاں اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی دنیا کے دوسرے ممالک کے کیمونسٹوں کی طرح لینن ہی کے نظریۂ انقلاب کی حامی تھی:۔

"ہمارا مقصد اس بات پر زور دینا قطعی نہیں ہے کہ مطلق العنان حکومت صرف مسلسل باقاعدہ اقدام یا منظم حملے ہی سے ختم کی جا سکتی ہے یہ نظریہ بے تکا اور ناقابل عمل ہوگا، اس کے برخلاف یہ قطعی طور پر ممکن اور تاریخی اعتبار سے کہیں زیادہ اغلب ہے کہ مطلق العنان حکومت کسی بے ساختہ شورش یا غیر متوقع سیاسی پیچیدگیوں کے زیر اثر آکر ختم ہو جائے...."

(لینن سیلیکٹڈ ورکس شائع کردہ ماسکو سنہ ۱۹۶۷ء ص ۴۲)

اس کے علاوہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو روس کی آشیرواد حاصل تھی۔ اسی بنا پر ہندوستان کے کمیونسٹوں نے روس جرمن اتحاد کو جسے مغرب کے بعض مصنفین نے HITLER STALIN HONEY MOON کا دلچسپ نام دیا ہے برطانیہ کی مخالفت میں جنگ کی حد تک کانگریس کی ہمنوائی کی، لیکن ادھر روس اور جرمن کی لڑائی چھڑی ادھر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے انگریزوں کے موقف کی حمایت شروع کر دی کیونکہ روس ہٹلر کے ہاتھوں زک اٹھا کر اتحادیوں میں شامل ہو گیا تھا، راتوں رات ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی میں اس تبدیلی کی بنا پر اشتراکی حضرات ہندوستان کے سنجیدہ طبقے کی نظر میں ابن الوقت اور نفتھ کالمسٹ ہو کر رہ گئے تھے (دی کمیونسٹ پارٹی ان انڈیا از ایم آر میسانی) بہرحال ہندوستان کی طرح روس بھی مختلف النوع معاشرتوں، تہذیبوں اور زبانوں کا ملک ہے۔ وہاں کے باشندوں کو اپنی اپنی زبان، اپنی اپنی تہذیب اور اپنی اپنی معاشرت کو زندہ رکھنے کی اجازت جس طرح دی گئی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوگا جو مارلیس ہنڈس (MAURICE HINDUS) کی کتاب "مدر رشیا" (MOTHER RUSSIA) سے ماخوذ ہے مارلیس ہنڈس مغربی دنیا میں اشتراکی روس کے عظیم ترجمانوں میں شمار ہوتے آئے ہیں جنہوں نے روس کے نظام زندگی کو مغربی نقطۂ نگاہ سے رد کر دینے کی بجائے خلوص اور ہمدردی سے اہل مغرب کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ وہ پُرخلوص انداز میں اشتراکی روس کے

جدید نظام کے رطب اللسان رہے ہیں اس لئے ان کو متعصب یا جانب دار یا پراپگنڈسٹ نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ عام طور پر مغربی مصنفین کو کہا جاتا رہا ہے۔ مارپس ہنڈس لکھتے ہیں:

"روس میں قریب قریب سو مختلف قومیتیں آباد ہیں بلکہ زیادہ، اگر ان نسلی گروہوں کو شامل کر لیا جائے جو تقریباً گمنام ہیں اور دور دراز علاقوں خصوصاً روسی ایشیا اور روسی یورپ کے شمال میں آباد ہیں۔۔۔ زبان، تاریخ اور ان قومیتوں کے تمام خالص قومی پہلوؤں کا نہ صرف احترام کیا جاتا ہے بلکہ ماسکو (اشتراکی حکومت روس) نے ان کو بھرپور انداز میں ابھارا ہے۔۔۔۔ ماسکو جاتے ہوئے جب میں ایران کے صدر مقام طہران میں مقیم تھا میں نے سوویت ازبکستان سے وہاں آئے ہوئے موسیقاروں اور گلوکاروں کا مظاہرہ دیکھا وہ اپنے دیس کا لباس پہنے ہوئے تھے اپنے دیس کی زبان بولتے تھے، قدیم دیسی ساز بجاتے تھے قدیم دیسی رقص پیش کرتے تھے اور اپنے قومی اور خالص دیسی یا مقامی تمدن کی تصویر بنے ہوئے تھے۔"

(مدر رشیا از مارپس ہنڈس ص ۹۹)

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی اپنے منشور میں ہندوستان کی مختلف قومیتوں سے وعدہ کیا کہ اپنے علاقہ میں ایک آزاد اکائی کی حیثیت سے

ہر قومیت کو اپنی زبان اور تہذیب کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کی مکمل آزادی حاصل رہے گی۔ مارلیس ہنڈس رقمطراز ہیں۔

"اپنی معیشت اور اپنی سیاسی سرگرمیوں میں تمام قومیتیں ماسکو (مرکزی حکومت) کے تابع ہیں، کسی قسم کے انحراف یا یا تجاوز کو بے رحمی سے دبا دیا جاتا ہے۔"

(مدر رشیا از مارلیس ہنڈس ص۹۹)

ہندوستان کے اشتراکی منشور میں عوام کو یقین دلایا گیا ہے کہ علاقہ داریت کی بنیاد پر سترہ قومی ریاستوں میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہر ریاست کو آزادی ہوگی کہ وہ آزاد رہے یا ایک وفاقی ہندوستان کی تشکیل کے لئے دوسری ریاستوں سے الحاق کرے منشور میں جہاں مسلم لیگ کو پاکستان کے لئے اور کانگریس کو ہندو اسٹیٹ کے قیام کے لئے سترہ قومی ریاستوں میں جدوجہد کی آزادی کا یقین دلایا گیا تھا وہاں کمیونسٹ پارٹی نے اپنے ذمے یہ کام لیا تھا کہ وہ ان سترہ قومی ریاستوں کا رضاکارانہ طور پر اتحاد قائم کرے گی یعنی سترہ قومی ریاستیں مکمل طور پر آزاد ہوں گی اور پاکستان، ہندو استھان یا وفاقی ہندوستان کی تشکیل کے لئے انہیں ترغیب دی جائے گی اور یہ ان کے صوابدید پر ہوگا کہ وہ تعاون کریں نہ کریں جو جماعت روس کے اتحادیوں میں شامل ہونے کی ہندوستان میں جنگ کی حد تک انگریزوں کے موقف کی راتوں رات حمایت پر آمادہ ہو گئی تھی وہ روس میں قومیتوں کے موقف سے آنکھیں چرا کر ہندوستان

کی قومیتوں کو حق خود ارادی دینے کی تحریک کیوں پیش کر رہی تھی، کیا ہندوستان کی قومیتوں کے ساتھ فریب نہیں کیا جا رہا تھا، روس میں بقول مادیس ہنڈس تمام قومیتیں معاشی اور سیاسی آزادی سے محروم ہیں۔ روس میں انقلاب کے وقت بھی ایسی قومیتیں موجود تھیں جو روسی شہنشاہیت کے تحت اپنی انفرادی حیثیتوں کی مالک تھیں ان قومیتوں میں جہاں اشتراکیوں نے اپنے ہمدرد اور ہم نوا پالئے انہیں فوجی امداد بہم پہنچائی۔

• اشتراکیوں کی (روس میں) کامیابی یا ناکامی کا دارومدار انقلابی نظریہ پر نہیں بلکہ فولاد اور خون پر تھا، قدیم روس کی وہ قومیں جن کے جغرافیائی محل وقوع بہتر تھے آزاد ریاستیں قائم کر سکے۔ ان کی حکومتیں بھی اشتراکی نہیں تھیں پولینڈ، فن لینڈ، اور بالٹک ریاستیں ایسی ہی تھیں ان کے مقابلے جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان کی جمہوریتیں بمشکل دو سال سے زیادہ قائم رہ سکیں اور وہ قومیتیں جن کا جغرافیائی محل وقوع بہتر نہ تھا اشتراکی حکومت کے زیر نگیں آگئیں۔ یوکرین، وہائٹ رشیا، والگا اور یورال کے تاتاری اور وسطی ایشیا کے باشندے ان میں شامل ہیں ان قوموں کی قومی تحریکوں کے خلاف اشتراکی کامیابی کا سبب طاقت کا استعمال تھا۔"

(فرام لینن ٹو میلنکوف از ایچ ایس واٹسن)

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"نئی اشتراکی حکومت کے تحت اسٹالن کو قومیتوں سے متعلق امور و مسائل کا وزیر COMMISSAR OF NATIONALITIES نامزد کیا گیا، زار کی حکومت یا عبوری حکومت کے تحت ایسا کوئی عہدہ نہیں تھا۔۔۔۔ سرکاری حیثیت سے وہ پہلی بار عوام کے سامنے نومبر ۱۹۴۷ء میں آیا جب اس نے فن لینڈ کی سوشیل ڈیموکریٹک کانگریس کے سامنے اشتراکی حکومت کی جانب سے فن لینڈ کو آزادی دیئے جانے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان اسٹالن کے قبل انقلاب نظریات کے عین مطابق تھا کہ روسی شہنشاہیت کے تحت ہر مظلوم طبقہ عوام کو ایک آزاد اور مقتدر حکومت قائم کر لے کا حق دیا جانا چاہیئے (روس میں) اشتراکیوں کے ایوان حکومت پر قابض ہوتے ہی لینن اور اسٹالن نے ایک ایسا اعلان فوری طور پر تیار کیا تھا اس توقع پہ کہ اس اعلان سے متاثر ہو کر مختلف قومیں یا نسلی گروہ اشتراکی یا مزدور انقلاب برپا کر کے خود ہی اشتراکی روس میں شمولیت اختیار کر لیں گے، لیکن یہ بہت جلد واضح ہو گیا کہ یہ صرف حسن ظن تھا روس میں علحدگی پسندی کا رجحان خصوصاً یوکرین کے باشندوں کی جانب سے اس قدر بڑھا کہ دو مہینے

بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ اسٹالن نے اپنا نظریہ تبدیل
کر دیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ حق خود ارادی بورژاؤں
کے لئے نہیں بلکہ محنت کش عوام ہی کے لئے ہے دوسرے
الفاظ میں ان کے لئے جو اشتراکی قیادت کو تسلیم کرتے ہیں"

COMMISSAR OF NATIONALITIES

کی حیثیت سے اسٹالن نے روس کی مختلف نسلی گروہوں
اور علاقوں کو (پہلے پہلے) خاصی آزادی دینی شروع کی تھی
اور اب اس کا یہ موقف تھا کہ تمام باشندوں پر حکمرانی کا اختیار
ماسکو (مرکز) ہی میں مرکوز ہونا چاہیئے جیسا کہ زار روس
کے تحت ہوتا آیا تھا۔"

(دی نیو یورک ٹائمز از مسٹر ڈبلیو میرس)

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اشتراکی روس نے جنم لیا تھا۔ روس میں قومیتوں اور نسلی گروہوں سے جو وعدے کئے گئے اور بعد میں جو سلوک ان کے ساتھ روا رکھا گیا ہندوستان میں شاید اسی کو دہرایا جا رہا تھا انقلاب روس سے آج تک اشتراکی حضرات کے وطیرے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اشتراکیوں کا یہ اصول بن گیا ہے کہ اپنے مفاد کی خاطر ہر وعدہ کیا جائے ہر قسم کا اصول بنا لیا جائے اور حسب ضرورت اسے توڑ دیا جائے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی نازی افواج نے روس پر پیش قدمی سے قبل یورپ کی کئی آزاد اور خود مختار ریاستوں کو ہڑپ کر لیا تھا" جنگ کے دوران جو معاہدہ برطانیہ

روس اور امریکہ میں ہوا تھا اس کا ایک مقصد اس معاہدے کے آرٹیکل نمبر (۵) میں یوں درج ہوا:

"معاہدے کے فریقین، ہر فریق کی حیات سے متعلق مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے منظور کرتے ہیں کہ امن کے قیام کے بعد یورپ میں معاشی خوشحالی اور مفاداتِ عامہ کے تحفظ کی ضمانت کے لئے قریبی اور دوستانہ تعاون سے مل جل کر کام کریں گے، ان مقاصد کے حصول کے لئے وہ اقوام متحدہ کے مفادات کو پیش نظر رکھیں گے اور ان اصولوں کے تحت سرگرم کار ہوں گے کہ کوئی فریق اپنی حدود کی توسیع کے لئے کوئی علاقہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا، اور نہ دوسری ریاستوں کے معاملات میں داخل انداز ہو گا۔"

روس جس کے وزیر اعظم اور سیاہ و سفید کے مالک ان دنوں جوزف اسٹالن تھے اس معاہدہ کا ایک فریق تھا۔ اس معاہدہ پر ۲۶ مئی ۱۹۴۲ء کو دستخط ہوئے اس سے قبل ۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو اسٹالن نے ایک تقریر میں کہا

"روس کا پہلا مقصد اپنے علاقہ (وہ علاقہ جس پر جرمنوں نے قبضہ کر لیا تھا) کی بازیابی ہے اور دوسرا مقصد یورپ کے ان باشندوں کو جو غلام بنا لئے گئے ہیں آزادی سے ہمکنار کرنا اور ان کے داخلی معاملات میں خارجی مداخلت کے بغیر انہیں اپنے موقف کا فیصلہ کرنے کے مواقع

فراہم کرنا ہے۔"

اسٹالن نے جنگ کے اختتام کے بعد مذکورہ معاہدے اور مذکورہ وعدے کی صریح خلاف ورزی کی، اسٹالن نے خود ہی ان مقاصد کو فراموش کردیا. جن کا جنگ کے دوران وہ بڑے زور و شور سے اظہار فرماتے تھے، اس کی کچھ تفصیل سن لیجیے:

"جرمنی کے مقابلے سوویت یونین کے ستر لاکھ آدمی مارے گئے اور جنگ پر تقریباً دو سو ارب امریکی ڈالر صرف ہوئے ان نقصانات کے باوجود روس پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور تھا، بین الاقوامی سطح پر سوویت یونین کا موقف اس قدر بہتر پہلے کبھی نہیں تھا..... آٹھ یورپی ریاستیں (البانیہ، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، فن لینڈ، ہنگری، پولینڈ اور رومانیہ) جن کو جرمنوں سے نجات دلانے کے بعد) سوویت یونین میں ضم نہیں کیا گیا ہے بلکہ جو ابھی تک (۱۹۵۲ء) سوویت یونین کے حلقے میں شامل ہیں. مجموعی طور پر یہ پانچ لاکھ ساٹھ ہزار مربع میل پر پھیلی ہوئی ہیں. ان کی مجموعی آبادی دس کروڑ نفوس پر مشتمل ہے اور ان کی مجموعی قومی آمدنی سوویت یونین کی قومی آمدنی کی تقریباً نصف ہے ان آٹھ ممالک میں سے (فن لینڈ اور مشرقی جرمنی کے مستثنیات ہونے کی بنا پر) چھ ممالک

میں مابعد جنگ، ترقیات نے وہی خطوط اختیار کیے جو ایک ساتویں (اشتراکی لیکن سوویت اثرات سے مبرا) جمہوریہ یوگوسلاویہ میں اختیار کیے جا چکے تھے۔ سوویت یونین کی کامیاب فوجی پیش قدمی کی بنا پر جہاں جہاں جرمن افواج پیچھے ہٹ جانے یا ہتھیار ڈالنے کی بنا پر قبضہ چھوڑتی گئیں وہاں وہاں فاتح روسیوں یا ان کے حلیفوں (جیسے یوگوسلاویہ کے سوویت پرست عناصر) نے ایک مختار کل مشترکہ حکومت قائم کر دی، ان حکومتوں میں ان جماعتوں کے نمائندے شامل ہوتے تھے جنہوں نے نازیوں کے خلاف قومی تحریکوں میں حصہ لیا ہوتا، ان مشترکہ حکومتوں کی خصوصیت یہ ہوتی کہ ان میں وزیر برائے امور داخلہ کسی کمیونسٹ ہی کو بنایا جاتا۔ یورپی ممالک میں پولیس کا محکمہ راست طور پر وزیر برائے امور داخلہ کے تحت ہوتا ہے ان جماعتوں کو جو اس اشتراک سے غیر متعلق رہتیں نازیوں کی مدد کرنے اور ان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے الزام کے تحت کچل دیا جاتا یا مفلوج کر دیا جاتا کیوں کہ ذرائع مواصلات (اخبارات، ریڈیو، کاریں، جلسہ گاہیں وغیرہ) کو جن پر حکومت کا سخت ترین کنٹرول ہوتا وہ استعمال ہی نہ کر سکتیں، پھر اس الزام کا صحیح ہونا بھی ضروری

نہیں ہوتا، پولینڈ کی مثال موجود ہے۔ اسی اثنا میں قومی معیشت کو خاطر خواہ حد تک قومیا دیا جاتا تاکہ عاملین پیداوار مکمل طور پر حکومت کے محتاج ہو جائیں۔"

"پولیس پر مکمل طور پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد کمیونسٹ دوسرا قدم بڑھاتے یعنی مشترکہ حکومت کے ان غیر اشتراکی اراکین کو جو ملک کی آزادی کی طرف مائل نظر آتے، گرفتاریوں اور دھمکیوں کے ذریعہ ہراساں کر دیا جاتا۔ یوگوسلاویہ اور ان چھ ممالک میں جو سوویت یونین کے کنٹرول میں تھے ۱۹۴۶ء کے زیادہ اور ۱۹۴۸ء کے کچھ عرصے تک اس قسم کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔"

"تیسرا قدم ملک کے ڈھانچے کی از سر نو ترتیب اور سیاسی طور پر کمیونسٹ اجارہ داری کا استحکام تھا، اس صورت میں حکومت میں اشتراک کو بہ ظاہر برقرار رکھنے اور اس حکومت کو مشترکہ حکومت کا نام دینے کی غرض سے کابینہ میں غیر اشتراکی جماعتوں کو بھی نمائندگی دی جاتی تھی، لیکن نمائندگی کا فرض منصبی ان افراد کو سونپا جاتا جو درپردہ اشتراکی ہوتے جیسے چیکوسلاواکیہ میں فیرلنگر اس طرح اختلاف رائے کی تمام منظم صورتوں کا قلع قمع

کر دیا جاتا رہا، بنیادی آزادیاں (ذاتی آزادی، تقریر و تحریر کی آزادی، تحریک کی آزادی وغیرہم) ختم کر دی گئیں یا اس قدر پابندیاں عائد کر دی گئیں کہ آزادیاں برائے نام ہی رہ گئیں، اجتماعیاتی مہم کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا اور زیادہ تر شہریوں کو اجرت داروں یا تنخواہ داروں کی حیثیت دے دی گئی اس طرح اپنی اجرت یا تنخواہ کے لئے وہ حکومت کے محتاج ہو گئے۔ تعلیم عامہ، صحافت اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت پر حکومت کا اجارہ ہو گیا، جبری محنت کے مراکز کھولے گئے اور موجودہ مراکز کی توسیع کی گئی ایسے شہریوں کو گرفتار کر لیا گیا جن کے منحرف ہونے کا امکان تھا یا جو منحرف ہو چلے تھے، چند کو پھانسی یا گولی کے ذریعہ موت کی سزا دی گئی تاکہ ان شہریوں کو خوف زدہ کیا جا سکے جو اشتراکی آمریت کے خلاف غم و غصہ رکھتے تھے۔ یہ تکمیلی کارروائیاں سنہ ۱۹۴۷ء کے اواخر تک البانیہ، بلغاریہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ میں اور سنہ ۱۹۴۸ء میں پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری میں اور سنہ ۱۹۴۹ء میں مشرقی جرمنی میں اختتام کو پہنچیں۔"

(دی رائیز آف موڈرن کمیونزم از میسیو سلوڈ وری)

ہنگری میں ۱۹۵۶ء یعنی خردشچوف کے دورِ حکومت میں اور چیکوسلواکیہ میں ابھی حال ہی میں تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لئے وسیع پیمانے پر روس کی جانب سے فوجی مداخلت اور اس مداخلت پر ان ملکوں کے عوام کا ردِ عمل ابھی تو سب ہی کو یاد ہے۔ یہ تو یورپ کے ان آمدِ ملکوں کو حشر ہوا جن پر نازیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور جن کو آزاد کرانے کے بعد کسی قسم کی خارجی مداخلت کے بغیر وہاں کے باشندوں کو اپنے مستقبل کے لئے حقِ خود ارادی دینے کا وعدہ اسٹالن نے بہ نفسِ نفیس کیا تھا اور اسی بنیاد پر روس نے اسٹالن کی قیادت میں امریکہ اور برطانیہ سے معاہدہ کیا تھا یہ سب کچھ اسٹالن کی زندگی میں ہو چکا تھا، اور ۱۹۵۳ء میں جب اس کی آنکھیں بند ہوئیں، یہ ممالک کمیونزم کے آہنی شکنجے میں جکڑے جا چکے تھے خردشچوف نے اسٹالن کی پالیسی اور ظالمانہ طریقِ حکومت سے حد درجہ اختلاف کیا، لیکن ان ممالک کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جن پر روس نے اسٹالن کے دورِ حکومت غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا بلکہ ہنگری میں آزادی کی تحریک اٹھی تو اسٹالن کو ظالم اور خونخوار ڈکٹیٹر کہنے والے خردشچوف نے اس تحریک کے حامیوں کو جو ہنگری کے عوام ہی تھے، گلی کوچوں میں ٹینکوں تلے کچلوا دیا۔ کوسیجن نے حال ہی میں فوجی دباؤ کے ذریعہ چیکوسلواکیہ کی تحریک کچل دیا۔ ایشیا میں بھی ایک ایسا ہی حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا:

۱ دوسری جنگِ عظیم کے دوران سوویت افواج نے ایران کے

شمالی علاقہ پر قبضہ کرلیا تھا، جبکہ برطانیہ نے
جنوب مغربی علاقہ [illegible] کیا، برطانیہ کی فوجیں جنگ
کے اختتام کے بعد ایران کا مقبوضہ علاقہ خالی کرگئیں سویت
افواج کو بھی چند مہینوں میں اسی طرح مقبوضہ علاقہ
خالی کر دینا چاہیئے تھا؛ لیکن وہ وہیں ڈٹی رہیں۔
بالآخر امریکہ اور برطانیہ [illegible] کے تحت جو اقوام متحدہ کے ذریعہ
بروئے کار لایا گیا تھا، سویت افواج ١٩٤٦ء میں ایران
سے روانہ ہوئیں، لیکن یہ انخلا اس طرح عمل میں آیا. کہ
سویت حکام آذربائیجان میں جو سویت یونین کی سرحد
سے لگا ہوا، اور شمال مغربی علاقہ میں ایران کا کثیر الآباد
صوبہ ہے ایک صوبجاتی انتظامیہ چھوڑ گئے. جو اشتراکیوں
کے تحت تھی چند مہینوں کے انتظار کے بعد ایران کی
مرکزی حکومت نے آذربائیجان فوج روانہ کردی مختصر
سی لڑائی کے بعد ہی حکومت اس صوبہ کا نظم و نسق
سنبھال سکی؟

(دی رائیز آف موڈرن کمیونزم از میسیو سلویڈ دری)

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں کمیونسٹ پارٹی کا آزادیٔ ہند کے لئے
پیش کیا ہوا منصوبہ ایک چیستان نہیں رہ جاتا. بلکہ ہندوستان کے
چالیس کروڑ عوام کے خلاف ایک منظم سازش اور روس کے رہنماؤں کے

طریق کار کی صحیح تقلید کا ایک مظاہرہ تھا، بہ الفاظ دیگر روس کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے لئے ہندوستان میں زمین ہموار کی جا رہی تھی: تاکہ دنیا کے نقشے پر ایک عظیم الشان اشتراکی ملک جنم لے سکے۔ کمیونسٹ پارٹی کے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے پی سی جوشی نے لکھا:

"ہماری سیاسی لیڈروں کی نئی نسل کو ہندوستانی زندگی کے حقیقی ارتقا کو سمجھنا چاہیئے اور نہ صرف انگلستان میں جمہوری تحریک کا مطالعہ کرنا چاہیے جو ایک واحد قوم کی اساس پر بڑھی بلکہ سوویت روس اور یوگوسلاویہ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے، جہاں متعدد قوموں کو بھائیوں کی طرح متحد کرکے ایک نئے انداز کی جمہوریت قائم کی گئی جب تک ہم ایسا نہیں کریں گے ہم حقیقی آزادی کے اصولوں کا اطلاق نہیں کر سکیں گے اور نہ حقیقی ہندوستانی جمہوریت کی بنیاد رکھ سکیں گے بلکہ اپنے مقصد سے دور اور دور ہی ہوتے جائیں گے۔"

(فریڈم پروگرام آف انڈین کمیونسٹ)

روس میں مختلف قومیتوں کو جس طرح فریب دے کر آخر کچل دیا گیا کہ ان کی نہ سیاسی حیثیت ہی ..... کچھ رہی اور نہ معاشی اعتبار سے وہ اپنے وسائل کے مالک رہے بلکہ ان کا وجود ہی ختم کر دیا گیا اور ان حرکت

انہیں بدترین سامراجی انداز میں کچلا جا رہا ہے۔ رہنگری، چیکوسلاکیہ) ہے
پی سی جوشی ایک نئے انداز کی جمہوریت کا خیال فرماتے ہیں جو متعدد قوموں کے
بھائیوں کی طرح اتحاد سے وجود میں آئی ہے۔ کیا کمیونسٹوں کا یہ منصوبہ واضح
نہیں ہے کہ ہندوستان کی سترہ ریاستوں یا صوبوں کا وہ اسی انداز سے
ایک اتحاد قایم کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے
لیڈروں کی نئی نسل جو یقیناً کیمونزم سے متاثر تھی یا کیمونزم کی حامی تھی
اس طریق کار کا مطالعہ کرے جو مختلف قوموں کو بھائیوں کی طرح متحد
کر کے روس اور یوگوسلاویہ میں ایک نئی طرز کی جمہوریت کو شکل دے گیا۔
یہ ظاہر یہ یقین کرتے ہوئے تکلف ہوتا ہے کہ ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی
اپنی کمعمری اور کم مائیگی کے باوجود کیونکر سوچ سکتی تھی کہ وہ ہندوستان
میں برسراقتدار آسکے گی لیکن جن ممالک میں کیمونسٹ عناصر حکومتوں پر
قابض ہوتے ہیں وہاں عموماً رائے عامہ ان کی تائید میں نہیں تھی اور نہ انہیں
عوام کی اکثریت کی تائید حاصل تھی بلکہ اشتراکی حضرات نے توڑ جوڑ ہی کے
ذریعہ کامیابی حاصل کی۔ یورپ کے آٹھ ممالک میں اشتراکیوں کو وہاں
کے عوام سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہونے کے باوجود اور عوام کی جانب سے کسی قسم
کی مدد کے بغیر حکومتوں پر قابض ہوئے، تفصیلی طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔
روس میں اشتراکیوں کی کامیابی کے اسباب کچھ مختلف نہیں تھے،
روس بھی ہندوستان کی طرح ایک وسیع ملک ہے۔ جہاں زار اور اس کے
حواریوں کے ظالمانہ طرز حکومت نے عوام اور سنجیدہ سیاسی عناصر میں

بے دلی اور بے اطمینانی پھیلا رکھی تھی، عجیب افرا تفری کا عالم تھا۔ جب وہاں ایک عبوری حکومت ان سیاسی عناصر کی کاوشوں سے قائم ہوئی جو روس کو مغربی طرز کا ایک جمہوری ملک بنانے کی فکر میں تھے لینن اور ان کے ہرکاروں نے اس حکومت کو ناکام بنا کر روس میں غلبہ حاصل کیا، جو وعدے عوام سے کئے گئے اور مختلف قومیتوں سے جو پیمان باندھے گئے تھے ان کو بالائے طاق رکھ کر سارے روس پر آمریت مسلط کر دی گئی جس کی کچھ تفصیلات گذر چکی ہیں، اشتراکی حضرات ہندوستان میں بھی ایسی ہی عبوری حکومت کے قیام کے لئے کوشاں تھے اور حال ہی میں پاکستان میں مارشل لاء کے نفاذ سے قبل اشتراکی حضرات ایسی ہی عبوری حکومت کے قیام کے لئے خواہاں تھے۔ جس طرح انہوں نے ہندوستان میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ "قومیت اور علاقہ واریت کی بنیاد پر ہندوستان کو سترہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر ریاست کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ مکمل مساوات کی بنیاد پر ایک ہندوستان میں اپنے (مجوزہ صوبوں یا ریاستوں کے) آپس کے تعلقات کی نوعیت کا تعین آپس میں گفت و شنید کے بعد کر سکیں" اسی طرح پاکستان میں بھی کمیونسٹ حضرات راگ الاپ رہے ہیں کہ

> پاکستان واضح طور پر پانچ مختلف قوموں میں بٹا ہوا ہے بنگالی، سندھی، بلوچ، پنجابی اور پٹھان۔۔ پس موجودہ عوامی بغاوت کا بنیادی مقصد محض بنیادی اور جمہوری

حقوق کی بحالی نہیں ہے، بلکہ محض قوموں کے درمیان اس
فرق اور استحقاق کو رفع کرنا ہے جو ایک قوم کو دوسری
قوم کے استحصال میں مدد دیتا ہے۔
(ویکلی پاکستان ڈھاکہ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۶۹ء بحوالہ سہ روزہ ایشیا لاہور)

ابھی ابھی کراچی میں ظہیر نقوی بین الکلیاتی مباحثے کے موقع پر کنٹرک ہال میں این ایس ایف (اشتراکی طلباء کا گروپ) نے ایک ہینڈ آوٹ تقسیم کیا، جس میں یہ تحریر تھا۔

"پاکستان مختلف قومیتوں کا وطن ہے جن کی الگ الگ تہذیبیں اور زبانیں ہیں اور پاکستان میں مختلف مذاہب اور عقائد رکھنے والے لوگ رہتے ہیں مختلف زبانوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جانا چاہیئے۔"
(سہ روزہ ایشیا لاہور اشاعت ۱۸؍نومبر ۱۹۶۹ء)

تحریک پاکستان اور اشتراکی نقطۂ نظر

ہندوستان میں کانگریس کی جدوجہد کے متعلق کیمونسٹ پارٹی کے نقطۂ نظر سے ہمیں بحث نہیں پاکستان کے قیام کے متعلق ان کا نقطۂ نظر خاصا واضح ہو چکا ہے تاہم اختتام سے قبل اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لئے کہ اشتراکی حضرات نے کانگریس کی طرح قیام پاکستان کی بھرپور

مخالفت کی تھی، کچھ اور اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"ہماری (کمیونسٹ) پارٹی مسلمانوں کے اس مطالبہ کی حمایت کرتی ہے کہ انہیں حق خود ارادی دیا جائے، لیکن منصفانہ حد بندی پر زور دیتی ہے اور تقسیم شدہ ہندوستان کی بجائے واقعی رضاکارانہ بنیاد پر آزاد انڈیا یونین کے قیام کا منصوبہ پیش کرتی ہے۔"

"..... لیگ کا نعرہ ایک مسلمان ایک قوم ہیں غیر معقول ہے ..... در حقیقت اس نظریہ کے پیش نظر ایک مسلمان ایک قوم ہیں، لیگ کے لیڈر مسلم بیداری کی تاریخ کی توضیح تک نہیں کر سکتے، نہ ماضی کے حوالے سے اور نہ حال کے زندہ تجربے کے حوالے سے۔ آخر کیوں صوبۂ سرحد کے مضبوط پٹھان جنہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی تحریک کو پروان چڑھایا لیگ کی بجائے کانگریس سے وابستہ ہوئے؟ اس بنا پر کہ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کانگریس کے دوش بدوش رہ کر ہی برطانوی تسلط کا خاتمہ کر کے آزاد پٹھانستان قائم کر سکتے ہیں۔ کیا یہ نظریہ کہ مسلمان ایک قوم ہیں لیگ کے لیڈروں کو کشمیریوں کی قومی بیداری کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ شیخ عبداللہ کی قیادت میں کشمیر نیشنل کانفرنس ان کشمیریوں کی قومی بیداری

کی ترجمانی کرتی ہے جن میں (۸۲) فیصدی مسلمان ہیں یہ کانفرنس کشمیریوں کے لئے حق خود ارادی کا مطالبہ کرتی ہے مسلم اکثریتی علاقوں کے لئے حق خود ارادی کی بھی حمایت کرتی ہے اور اس کے باوجود وہ لیگ کی بجائے کانگریس سے زیادہ قریب ہے۔"

"..... مسٹر جناح جو مولویوں اور ملاؤں کی مذہبی فتنہ سامانیوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے غیر مذہبی سیاست کے علمبردار تھے اور پاکستان کا ایک جمہوری ملک کی حیثیت سے پرچار کرتے تھے ان ساری باتوں سے منحرف ہو چلے ہیں وہ اب چاہتے ہیں کہ پاکستان کا اسلامی مملکت کی حیثیت سے پرچار کیا جائے وہ لیگ کے لیڈروں کو اجازت دیتے ہیں کہ نیشنلسٹ مسلمانوں سے نمٹنے کے لئے مذہبی قدامت پرستوں سے مدد لی جائے اور لیگ کے کارکنوں کو اجازت دیتے ہیں کہ ہندوؤں کے خلاف شدید نفرت پھیلائیں..... اکتوبر ۱۹۴۵ء میں انہوں نے انتہائی قدامت پسند ٹوڈی مولویوں پر مشتمل اور نئی قائم شدہ جمعیت العلمائے اسلام کو مبارکباد کا پیغام بھیجا۔ ان مولویوں کا مقدم نعرہ قرآنی مملکت کا قیام ہے اور ان کا مقدم فرض قدیم جمعیت (جمعیت العلما) اور نیشنلسٹ

مسلمانوں سے بدترین مذہبی فتنہ پردازیوں کے ذریعہ
نمٹنا ہے"۔
لیگ کی قیادت ہندوستان کی تقسیم کے ذریعہ مسلم اکثریتی
علاقوں کے لئے اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کی فکر میں ہے"۔۔۔
اس طرح ہندوستان کی تقسیم کا سوال لئے ہوئے وہ برطانوی
حکام کے دروازے تک جا پہنچی ہے"۔
"برطانوی سامراجیوں کے مسلمان پٹھو لیگ میں اس لئے
پہنچے کہ مسلمانوں کو (پاکستان کے لئے) برطانوی آقاؤں
کے دروازے تک پہنچا دیں"۔
"یہ واضح ہونا چاہیئے کہ ہماری (کمیونسٹ) پارٹی کس حد تک
کانگریس کی حمایت کرتی ہے اور کہاں تک لیگ کی تائید کرتی
ہے اور کس حد تک دونوں سے اختلاف کرتی ہے۔۔۔
ہم لیگ کے چھ صوبوں کی غیر منصفانہ حد بندی (مراد پاکستان)
کے مطالبہ کی حمایت نہیں کرتے اور نہ اس مطالبہ کی تائید
کرتے ہیں کہ ملک کی تقسیم ہی مسلم اکثریتی علاقوں کے اقتدار
(آزادی) اعلیٰ کی ضمانت ہے"۔
(فریڈم پروگرام آف انڈین کمیونسٹس از پی سی جوشی)
پی سی جوشی نے اپنی مذکورہ سو صفحات پر مشتمل کتاب میں بائیس صفحات
پر مشتمل ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے منشور کی توضیح کرنے

ہوئے حسب ذیل الفاظ میں مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ دو حصوں میں ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

"ہم (کمیونسٹ) واحد غیر مسلم جماعت ہیں جس نے رضاکارانہ طور پر یہ مطالبہ تسلیم کیا اور اس مطالبہ کی تشہیر کی کہ مسلمانوں کو ان کے اکثریتی علاقوں میں مقتدر رہنا چاہیئے ہماری جماعت کے متعلق لیگی قیادت کے شبہات اور لیگی صحافت کی الزام تراشیوں کے باوجود ہم نے یہ سب کچھ کیا ہے، لیگ کا ہر سنجیدہ کارکن یہ جانتا ہے اور اسی بنا پر اس انداز سے ہماری عزت کرتا ہے کہ جس انداز سے وہ کسی غیر مسلم کی عزت نہیں کرتا کوئی مسلمان ہم سے آنکھیں ملا کر نہیں کہہ سکتا کہ اس کے مطالبہ کے لئے تحریک آزادی سے وابستہ اس طبقہ میں جہاں ہمارے عوام کے منتشر اور غیر متحد ہونے کی بنا پر اس کا گذر نہ تھا۔ ہم نے اس (مسلمان) سے بڑھ کر جد وجہد کی اور زیادہ تکلیفیں اٹھائیں، اس انصاف پسندی کے نام پر جس نے ہمیں اس کے حق آزادی کو تسلیم کرنے اور اس کے چھ علیحدہ صوبوں کے مطالبہ کو غیر منصفانہ محسوس کرنے کی ترغیب دی، اور مشترکہ آزادی ہند کے نام پر ہم اس (مسلمان) سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ غور کرے

کہ آزاد وطن میں آزاد علاقہ واری اکائیوں یا ریاستوں
کا ہمارا نعرہ دراصل اس (مسلمان) کے اپنے علاقہ میں
اس کے اقتدار (آزادی) کے مطالبہ کا نعرہ ہے اور
ساتھ ساتھ اسے اس طرح (اپنے علاقہ میں اپنی ہی حکومت
کے لئے) تمام آزادی پسند ہندوستانیوں کی حمایت
حاصل ہوجاتی ہے بشرطیکہ وہ انگریز حکام کے ہاتھوں
ہندوستان کی تقسیم کے مطالبے سے دستبردار ہوجائے
اور اپنے آزادی کے متوالے بھائیوں کے ساتھ سارے
ملک کی آزادی کے لئے دوش بدوش آجائے،
برطانوی حکام پر تکیہ کرنے سے ہندوستان بھی تقسیم
ہوگا، اور مسلمان ایک نئی غلامی سے دوچار ہونگے"

گزشتہ صفحات میں ان امکانات کا تفصیلی جائزہ لیا جاچکا ہے کہ سترہ آزاد ریاستوں میں ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں اگرچہ لیگ کو قیام پاکستان اور مسلم ریاستوں کا ایک فیڈریشن تشکیل دینے کے لئے جدوجہد کرنے کی آزادی ہوتی لیکن اس کے ڈھانچے میں جو کمیونسٹ پارٹی کے منصوبے کے تحت تشکیل پاتا، قیام پاکستان کی جدوجہد کس قدر بے معنی اور مسلم ریاستوں کا موقف کس قدر کمزور ہوجاتا۔ جس طرح سکھ کانگریس کا ان دنوں ساتھ دے کر آج اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے فاقے پر فاقے کر رہے ہیں اور شیخ

عبداللہ کانگریس کے دسترخوان پر منڈلانے کی سزا پا رہے ہیں اور کشمیر کو جہنم زار بنا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح گئی اور علاقہ دار کا ریاستیں اور قومیتیں کسمپرسی کے عالم میں مبتلا ہوتیں اور وہ عوام جو پاکستان میں سکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں خون کے آنسو رو رہے ہوتے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، جس طرح پروفیسر ریجی نلڈ کپ لینڈ کی تصنیف "دی کانسٹیٹیوشنل پرابلم آف انڈیا" کے حوالے سے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے خلاف والیان ریاست کے سہارے ایک ہوا تیار کیا گیا تھا اسی طرح اس پروفیسر کی تحریر کے حوالے سے پاکستان کے مستقبل کا خاکہ بھی تیار کیا گیا تھا

"۔۔۔ حقیقتاً ایک غیر منصفانہ اور غیر جمہوری نظریات کا حامی مسلمان ہی اس (قیام پاکستان) کو ایک قابل قبول حل تسلیم کرے گا، اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر سکھوں کو شمال مغربی پاکستان میں ان کی مرضی کے خلاف دھکیل دیا گیا تو شمال مغربی پاکستان ایک پرامن اور خوشحال علاقہ ہونے کی بجائے وسطی اور مشرقی یورپ کی طرح خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن جائے گا اسی طرح مشرقی پاکستان کو بھی امن نصیب نہ ہوگا اور وہاں مسلمانوں آسامیوں اور آسامی قبائل میں جو آسام میں آباد ہیں ٹھنی رہے گی، پھر بنگالی ہندوؤں اور بنگالی مسلمانوں میں

کبھی نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کا سلسلہ علیحٰدہ رہے گا
پروفیسر کوپ لینڈ ان اندیشوں کو محسوس کرتے ہوئے
استدلال کرتا ہے کہ پاکستان اس قدر طاقتور ملک نہیں
ہوگا کہ اپنی مدافعت کر سکے اور وہ (پروفیسر کوپ لینڈ)
موجودہ بجٹ سے یہ ثابت کرتا ہے یعنی اسے یقین ہے کہ
اس کے مجوزہ پاکستان (یعنی صوبہ سندھ، صوبہ سرحد
اور صوبہ پنجاب بجز انبالہ ڈویژن سے تشکیل پایا ہوا
مغربی پاکستان اور صوبہ آسام اور صوبہ بنگال بجز بردوان
ڈویژن سے تشکیل پایا ہوا مشرقی پاکستان) میں مسلمان غیر مسلم
مسلمانوں کا خون چوستے رہیں گے اور یہ علاقے مکمل طور پر
افلاس زدہ رہیں گے، ایک اور دلیل بھی اس نے پیش کی
ہے وہ کہتا ہے کہ ہندوؤں کی کثیر اکثریت تقسیم کے خلاف ہے:

"اور اس صورت میں (تقسیم ہند) یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ —
... کہ ہندو اور مسلمان مملکتوں (یعنی بھارت اور
پاکستان) میں خوشگوار تعلقات رہیں گے یا پاکستان
کے مسلمان اپنے کئے کا خمیازہ اٹھانے میں بھارت
کے ہندوؤں کی مدد کریں گے ... بہرصورت
دونوں علیحٰدہ مملکتیں اپنی علیحٰدہ فوجیں رکھیں گی۔
کیونکہ یہ قرین قیاس نہیں ہیں کہ ہندو اپنی مدافعت

کے لئے مسلمانوں کو معاوضہ دیں گے ؟" کپ لینڈ ص۹۵ حصہ سوئم

وہ (کپ لینڈ) کہتا ہے کہ اگر پاکستان قائم بھی ہوگیا تو وہ اس قدر طاقتور نہیں ہوگا کہ اپنی مدافعت کر سکے، وہ عیارانہ طور پر اس امکان سے مسرور نظر آتا ہے کہ اگر" تقسیم لازمی ثابت ہوئی تو ہر کوئی توقع ضرور رکھے گا، لیکن کسی کو یقین نہیں ہوگا کہ اس (تقسیم) کے خلاف ہندوؤں کی نفرت شدید دشمنی کی شکل اختیار نہیں کرے گی"، اس کے بعد گیا ہوگا؟ وہ (کپ لینڈ) منقسم ہندوستان میں جنگ کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔" اگر آنے والے برسوں میں کہیں جنگ ہوتی ہے اور اگر عالم گیر سطح پر اجتماعی امن کی کوشش سے اس جنگ کو موثر طور پر نہ روکا گیا تو منقسم ہندوستان میں یہ جنگ صریحاً ناممکن نہیں ہوگی۔" یعنی اس سامراجی پروفیسر کا استدلال یہ ہے کہ اگر ہندوستانی آپس میں سمجھوتہ نہ کریں گے تو ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئے گی۔ جب ہندوستان کی تقسیم ہوگی تو آپس میں جنگ ہوگی۔ اگر جنگ ہوگی تو یہ نہ صرف سارے ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے امن کے لئے تباہ کن ہوگی۔"

(فریڈم پروگرام آف انڈین کمیونسٹس از پی سی جوشی ۱۹۴۶ء)

یہاں یہ حقیقت بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اشتراکی حضرات واقعی مسلمانوں

کو بے توقوف بنانے پر تلے ہوئے تھے، پاکستان سے ان کاوں توڑنے اور تقسیم ملک کے خیال کو مسلمانوں کے لئے تباہ کن ثابت کرنے اور پاکستان کو ایک کمزور اور افلاس زدہ ملک کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے کیپ لینڈ کے قیاسات کو من وعن قبول کر لیا گیا اور اسی کے حوالے سے پیش کیا گیا تاکہ مسلمان مرعوب ہوں کہ یہ ایک ایسے ماہر امور آبادیات کی رائے ہے جس سے انگلستان کی برطانوی حکومت مشورہ لیتی ہے اور ہندوستان کا وائسرائے بھی جس کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر تقسیم ہند کا منصوبہ واقعی اس قدر خطرناک تھا کہ دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا اور بین الاقوامی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کو نہ روکے جانے کی صورت میں تیسری عالمی جنگ برپا ہو سکتی تھی، تو پھر اشتراکی منشور میں کمیونسٹ پارٹی نے کن مصلحتوں کے پیش نظر مسلم لیگ کو یہ اجازت دی کہ وہ ہندوستان کے سترہ حصوں میں تقسیم کے بعد مسلم اکثریتی علاقوں کے ایک آزاد اور مقتدر اعلیٰ وفاق کے لئے جدوجہد کر سکے گی۔" اس صورت میں بھی ایک تباہ کن جنگ کا امکان ہو سکتا تھا؟ دوسرے پاکستان میں خانہ جنگی کے امکانات تو کیمونسٹ پارٹی کو واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی سترہ ریاستوں یا صوبوں میں تقسیم کی صورت میں سارے برصغیر میں خانہ جنگی کے امکانات کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ سترہ ریاستوں یا صوبوں میں ہر صوبہ یا ہر ریاست کے باشندے تو ایک ہی عقیدے اور یکساں

مقامی روایات اور نسلی امتیازات کے حامل نہیں پائے جاتے بلکہ جیسا عرض کیا جا چکا ہے اور پی سی جوشی نے خود بھی فرمایا ہے کہ سکھ اپنے علاقے میں رہنے بسنے والی دوسری قومیتوں یا فرقوں سے الجھ پڑتے، کئی صوبوں میں ہندو اور مسلمان لڑ پڑتے، بنگال، سندھ، بلوچستان، گجرات، آندھرا، بہار، اور یو پی میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات بپا ہو جاتے، ادھر مرہٹے اپنے علاقے میں غیر مرہٹوں سے، سکھ پنجاب میں مسلمانوں سے، دکن کے صوبوں میں دراوڑی ہندوؤں سے برسرپیکار ہو جاتے، ان امکانات کو اس بنا پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ جیسے ہی برصغیر آزادی سے ہم کنار ہوا اور ہندوستانی عوام جو آزادی کے حصول جیسے عظیم مقصد کے لئے ایک طاقتور قوم کے مقابلے برس ہا برس سے اپنے سارے تفرقات بھلا کر ڈٹے ہوئے تھے، تو نئی یک جہتی کو نظر انداز کر کے بار آپس میں دست و گریبان رہے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے آزادی کے حصول کے بعد بڑی تیزی سے اہل ہند کی صفیں منتشر ہوئی ہیں اور عقائد کے علاوہ زبان اور نسل کی بنیاد پر اختلافات نے ان سیاست دانوں کے ہاتھوں شہ پائی جو ان بنیادوں پر عوام کے جذبات کو ابھار کر اور ان کی حمایت حاصل کر کے ابھرنا چاہتے تھے، اگر ان اختلافات ہی کے خطوط پر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آتی تو ذرا چشم تصور سے برصغیر کا منظر دیکھئے، کیا اشتراکی حضرات نے اس افراتفری کے امکانات کو چشم بصیرت سے دیکھا ہی نہیں تھا، اگر

پاکستان کا قیام ایک طرف مسلمانوں کے لئے اور دوسری طرف ساری دُنیا کے لئے تباہ کن محسوس ہو سکتا تھا. تو کیا سترہ آزاد صوبوں یا ریاستوں میں تقسیم ہو کر ہندوستانی عوام تباہ نہ ہو جاتے اور اس خانہ جنگی کے پیش نظر بڑی طاقتیں اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لئے مداخلت نہ کرتیں اور ایسی مداخلت کیا آج سے بائیس برس پہلے ایشیا میں ویت نام کو جنم نہ دیتی؟ اور اس کا خمیازہ ہندوستانی عوام نہ بھگتے۔ ؟

تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیوں؟

اشتراکی حضرات پاکستان کی تشکیل کے خلاف کیوں اس قدر سرگرم تھے، وہ کیوں چاہتے تھے کہ یہ ملک تقسیم نہ ہو، اور علاقہ واریت، قومیت، نسل، زبان اور مقامی روایات اور معاشرت کی بنیاد پر ملک کی تقسیم عمل میں آئے؟ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ مجوزہ پاکستان ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود پذیر ہونے کو تھا اور اشتراکیوں کو یہ یقین تھا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم ہو گئی اور ایک طرف ہندو اور دوسری طرف اسلامی مملکت قائم ہو گئی تو کمیونزم یا سوشلزم کے پرخچے اڑ جائیں گے اور دونوں ملکوں میں اشتراکیوں کے وجود کو برداشت ہی نہیں کیا جائے گا، اس طرح ایک اشتراکی ہندوستان کا منصوبہ خواب و خیال ہو کر رہ جائے گا، تقسیم کی صورت میں بھارت سے انھیں پھر بھی کچھ امید ہو سکتی تھی کہ کچھ عرصہ کے بعد وہاں ان کے

قدم جم سکیں گے کیوں کہ بھارت ایک مذہبی مملکت کے روپ میں وجود پذیر نہیں ہو رہا تھا، اور پھر بھارت میں مختلف النوع عقائد کے ماننے والے اس قدر تعداد میں موجود ہیں کہ آزادی کے حصول کے بعد بھی بھارت کا ایک مذہبی مملکت بن جانا خاصے طویل عرصہ تک ممکن نہ تھا لیکن پاکستان میں صورت حال مختلف تھی، اشتراکی حضرات جانتے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آرہا تھا۔ یہ بھی انہیں معلوم تھا کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلم باشندے مسلمانوں ہی کی طرح امن سکون اور آزادی کے ساتھ مساویانہ سطح پر زندگی بسر کر سکیں گے اور پاکستان جلد ہی اسلامی مملکت بن جائے گا، اس صورت میں پاکستان میں اشتراکی تحریک چلائی ہی نہ جا سکے گی اور اس طرح ان کے ہاتھ سے وہ صوبے نکل جائیں گے، جہاں کے باشندے مسلمان ہونے کے باوجود پسماندہ اور غریب ہیں اور آسانی سے اشتراکی فریب کا شکار ہو سکتے ہیں، مثلاً سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد دوسری جانب بنگال بھی ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا جو عموماً تخریبی عناصر کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے اس صوبے کا منشور میں خصوصی تذکرہ ہے اور خاص طور پر اس صوبہ کو یقین دلایا گیا ہے کہ اگر وہ آزاد رہنا چاہیں گے تو ان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا، غالباً قدرتی وسائل کے پیش نظر اشتراکی حضرات بنگال کو ایک آزاد اشتراکی مملکت کی شکل دینا چاہتے تھے۔ پاکستان کی صورت میں برصغیر کا خاصا بڑا حصہ جہاں اشتراکیوں

کو اپنی کامیابی کا سو فیصدی امکان نظر آتا تھا، اور اس کامیابی کے لئے زیادہ "محنت" بھی درکار نہیں تھی، ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے، اور رہا تی حصے ہیں ایسے پسماندہ اور افلاس زدہ علاقے کم تھے اور اس بنا پر وہاں اشتراکیوں کی کامیابی کے امکانات اتنے زیادہ اور یقینی نہیں تھے، اس بنا پر اشتراکیوں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی مخالفت بھرپور انداز میں کی۔ یہ اور بات ہے کہ پاکستان وجود میں آنے کے بعد اربابِ حکومت کی خود پسندی اور خود غرضی کی بنا پر اسلامی مملکت کی بجائے اربابِ حکومت اور اہلِ سیاست کی باہمی کشمکش کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا۔

پاکستان میں اشتراکی تحریک

ہندوستان میں کانگریس کی حمائتوں نے اشتراکیوں کے لئے حوصلہ افزا حالات ضرور پیدا کئے ہیں لیکن پاکستان میں قائد اعظم کی رحلت ہی سے ایوب خان کی مراجعت تک حالات کمیونیزم اور سوشلزم جیسی تخریبی سرگرمیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ موافق ہوتے گئے۔ خصوصاً نوجوان طبقہ، مزدور پیشہ، اور ملازم پیشہ طبقات ملک کے سیاسی حالات اور ان حالات کی بنا پر پیدا شدہ معاشی ابتری کی بنا پر باغیانہ انداز میں اپنے مسائل کا حل تلاش پر مائل ہوتے گئے عوام الناس

خصوصاً نوجوان اور مزدور طبقوں کا یہ اندازِ فکر اشتراکی تحریک کیلئے باعث برکت ہوتا ہے فرانسیسی انقلاب کی طرح ۱۹۵۸ء کے نام نہاد انقلاب نے جس کے بانی ایوب خانصاحب تھے اور جس کو سیاسی طور پر دیوالیہ ملک میں از سرِ نو آغاز کا ایک حسین انداز سمجھا گیا، بہت جلد عوام مایوس ہو گئے تھے۔ سنجیدہ حلقے تشویش کا نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ ملک میں حکومت ہی کے ہاتھوں CONTROLLED DEMOCRACY کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی جو اشتراکی نظامِ حکومت ہی کا ایک جزبہ تھا اور عوام میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بے اطمینانی سے پاکستان کی اشتراکی تحریک پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی، دوسری جانب ان اشتراکی حضرات کو جو ایوان حکومت کے علاوہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے اور عاملانہ اختیارات کے مالک تھے یا ان حضرات پر اثر و رسوخ رکھتے تھے جو عاملانہ اختیارات کے مالک تھے CONTROLLED DEMOCRACY کی بنا پر اشتراکی تحریک کو تقویت پہنچانے کے بہترین مواقع حاصل ہوئے ملک کا عالم یہ تھا کہ سیاسی جماعتیں پابند کر دی گئی تھیں. سیاسی سرگرمیوں کو خلافِ قانون قرار دیا جا چکا تھا سیاسی رہنما ایبڈو زدہ تھے یا نئی حکومت کے نازک مزاج کے پیشِ نظر خاموش ہو گئے تھے، آزادیٔ تحریر و تقریر کو شجرِ ممنوعہ کی حیثیت دی جا چکی تھی. قومی اخبارات حالات کے پیشِ نظر محتاط ہو گئے تھے یا محتاط روش اختیار کرنے پر.

مجبور کر دیے گئے تھے، جو صحافی "ہدایت نامۂ خاوند" کی پابندی پر
آمادہ نظر نہ آتے تھے ان کی مختلف انداز سے خاطر تواضع کی جا رہی تھی
(ہفتہ وار اقدام لاہور ۲۱ر اپریل ۱۹۶۱ء) ان حالات میں اگرچہ
اشتراکی حضرات کو بھی بر سر عام گل کھلانے کے مواقع نصیب نہ تھے
تاہم وہ بڑی تندہی سے زیر زمین برسر کار رہے، قانون کی تلوار ان
کے سروں پر بھی لٹکتی رہی اور وقتاً فوقتاً انہیں مجروح بھی کرتی رہی
لیکن مارشل لا کے نفاذ (۱۹۵۸ء) سے قبل ہی اشتراکی حضرات
بڑی تندہی سے زیر زمین کارروائیوں میں مصروف تھے، اس بنا پر
مارشل کے نفاذ کے بعد بھی انہیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے میں
زیادہ دشواری پیش نہیں آئی، مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی
پاکستان میں بھی اشتراکی تحریک نے علیحدگی پسند اور پاکستان
دشمن علاقہ وارانہ تحریکوں کے گٹھ جوڑ سے تقویت حاصل کی اس
طرح اشتراکی حضرات مشرقی پاکستان، بلوچستان، صوبہ سرحد اور
صوبۂ سندھ میں صوبہ واریت کو ہوا دیتے رہے ادھر وہ اندرون
ملک ہماری زراعت پیشہ آبادی تک رسائی کی راہیں ہموار
کرتے رہے، تیسری جانب شہروں میں انہوں نے مزدوروں کی
انجمنوں اور نچلی اور درمیانی سطح کے ملازم پیشہ افراد کی تنظیموں میں
رسوخ پیدا کرنا شروع کیا۔ کراچی کی بعض اشتراکی انجمنیں جو آج
اپنی سرگرمیوں کی بنا پر سارے ملک میں نیک نام ہو رہی ہیں انھیں

دنوں اشتراکی عناصر کے زیرِ سایہ آچکی تھیں طلباء کی انجمنیں
زندہ ہوئیں تو دھیرے دھیرے اشتراکی عناصر نے وہاں کے بھی
اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کی اور کئی خالص اشتراکی اسٹوڈنٹ لیڈر
جنم دیئے۔ ادبی انجمنوں میں بھی انہیں اثر و رسوخ حاصل ہو گیا،
اور جلد ہی دنیا پر آشکار ہو گیا کہ یہ ننھے جوان ہو کر نظریۂ پاکستان
ہی کا مضحکہ اڑائیں گے وسائل نشر و اشاعت ان حضرات کے
تصرف میں آ گئے اور ایسے حضرات کے افکار عام ہونے لگے جو اپنی
اشتراکی سرگرمیوں کی بنا پر حکومت کے بار بار معتوب ہو چکے۔
کلچرل ادارے قائم ہوئے تو وہاں بھی اشتراکی حضرات ہی کی "رونمایاں"
ہونے لگیں، حکومت کے تحت بر سرِ کار ثقافتی اداروں میں انہیں
ذمہ دارانہ حیثیتیں دی گئیں، یہ آج کل کی بات نہیں ہے، گذشتہ دس
گیارہ سال سے ہمارے یہ سارے ادارے سرخ عناصر کے
زیر اثر ہیں اب تو یہ عالم ہے کہ پاکستان کے ایک انتہائی کثیر الاشاعت
اردو روزنامے کے ایک ذمہ دار افسر نے راقم الحروف سے کہا تھا کہ
جس دن ادارتی اسٹاف میں اشتراکی خیالات کے حامی افراد کی ڈیوٹی
ہوتی ہے اس دن اشتراکی حضرات کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوتی
ہیں اور جس دن ڈیوٹی پر اسلام پسند افراد زیادہ ہوتے ہیں اس دن
جماعت اسلامی کی خبریں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی
اخبار اس قدر وسائل اور اشاعت رکھتا ہو لیکن اس اخبار کا یہ عالم ہے

کہ اس کی اپنی کوئی مستقل پالیسی نہیں ہے۔ یہی نہیں صدر ایوب کے
ذاتی عملے کے اعلیٰ ترین حلقوں، کابینہ اور کئی اہم وزارتوں کے اعلیٰ ترین
عہدوں پر اس دور میں ٹھیٹھ اشتراکی حضرات فائیز رہے ۱۹۶۲ء
کے دستور کی تدوین میں بھی انہیں نمایاں دخل حاصل رہا ذوالفقار علی
بھٹو جو سکندر مرزا کے آخری دورِ حکومت سے "قلمدان وزارت" اٹھائے
اٹھائے مختلف شعبوں سے ہوتے ہوئے آخرکار محکمہ امورِ خارجہ پر
جا متسلط ہوئے تھے اور اس وقت تک اس "قلمدان" کو سینے سے لگائے
صدر ایوب کے گیت گاتے رہے جب تک انہیں علاج کی غرض سے
سبکدوش نہیں کیا گیا، ابتداہی سے کمیونسٹ رہے ہیں۔ لندن سے
ایک رپورٹ میں جو ۱۹۶۱ء میں مرتب ہوئی تھی اور ۱۹۶۲ء میں
Betrayal in Pakistan کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی
مسٹر بھٹو کا حسبِ ذیل الفاظ میں "تذکرہ" کیا گیا تھا۔

MR. BHUTTO, MINISTER FOR FUEL AND NATURAL RESOURCES WAS A STAUNCH STALINIST AND WAS QUITE VOCAL UPTO THE DEATH OF STALIN

(Betrayal in Pakistan... page 47.)

(مسٹر بھٹو جو ایندھن اور قدرتی وسائل کے وزیر ہیں اسٹالن کے

نظریات کے زبردست حامی تھے۔ اور اسٹالن کی موت (۱۹۵۳ء) تک بڑے زور و شور سے اس حمایت کا اظہار کرتے تھے۔

ان دنوں مسٹر بھٹو کے متعلق یہ الفاظ بڑے عجیب سے لگتے تھے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کی انتہائی غیر عوامی حکومت کے تحت ایک اہم اور مایہ ناز وزیر تھے، مسٹر بھٹو جو آج عام جلسوں میں کہتے پھرتے ہیں کہ اگر انہیں کرسی عزیز ہوتی تو وہ اسلام آباد میں ہوتے اور چونکہ انہیں عوام عزیز ہیں اس لئے انہوں نے کرسی کو لات مار دی ہے کرسی ہی کی خاطر اپنے حقیقی نظریات کو بالائے طاق رکھ کر وزیر کی حیثیت سے مسلسل دس برس اس حکومت کی خدمت کرتے رہے جس نے عوام کو ہر اعتبار سے کچل کر رکھ دیا تھا۔ عوام بھولتے جا رہے ہیں کہ "چمچہ" کی اصطلاح کو سرکاری حیثیت کس نے دی یہ بھٹو صاحب ہی تھے جنہوں نے کراچی کے ایک خصوصی جلسہ میں (غالباً کسی کالج میں) حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ایوب کا چمچہ ہوں" افسوس ہے کہ وہ عوام جو بھٹو صاحب کو "ایوب کا چمچہ" سمجھتے تھے اور جس پر خود بھٹو صاحب نے احتجاج فرمایا تھا وہی عوام آج بھٹو صاحب کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگے ہیں، اور بھٹو صاحب جو ابتدا ہی سے اشتراکیت کے حامی اور اسٹالن کے غائبانہ شاگرد رہے ہیں اور جو کرسی ہلتے ہی ایوب خان کی مداحی میں دس سال مست رہے۔ کرسی سے گرتے ہی وہی آموختہ دہرانے لگے اور حیرت ہے کہ اس "آموختے" پر عوام جھومنے لگے، بہرحال اشتراکی تحریک کے لئے ایوب خان کے دور

حکومت ہیں قانونی پابندیوں کے باوجود مسلسل کام ہوتا رہا۔ مشرقی پاکستان میں اشتراکی خطرے کے وجود سے حکومت باخبر تھی، جنرل کے ایم شیخ نے روزنامہ نوائے وقت کے لندن کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا

" جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے حکومت اس (اشتراکی) خطرے کی بنا پر فکرمند نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق حکومت خود بھی اس کی وجہ سے پریشان ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کلکتہ سے بے حد قریب ہے اور پاکستانی کمیونسٹ کلکتہ سے مدد حاصل کر رہے ہیں اس وجہ سے مشرقی پاکستان میں حالات پراگندہ ہیں"
(نوائے وقت لاہور ۱۲ راگست ۱۹۶۱ء)

صدر ایوب نے بھی مشرقی پاکستان میں اشتراکی خطرے کے وجود کا اعتراف کیا تھا (روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۶ راگست ۱۹۶۶ء) جس پر روزنامہ نوائے وقت نے ۲۷ راگست ۱۹۶۶ء کو اپنے ادارتی کالم میں حکومت کو خبردار کیا تھا کہ مشرقی پاکستان ہی نہیں مغربی پاکستان میں بھی یہ خطرہ اتنی ہی شدت سے لاحق ہو چلا ہے۔ بہرحال ایوب خان کے برسراقتدار آنے سے پہلے اور بعد پاکستان میں مسلسل اور شدید قانونی پابندیوں کی بنا پر یہاں اس تحریک کو اس انداز سے پروان چڑھنے کے مواقع حاصل نہ ہو سکے کہ

مناسب وقت پر انقلابی خطوط پر ظہور پذیر ہونے کے لئے اس تحریک کو مخلص اور استوار قیادت نصیب ہو سکتی، چنانچہ اس دبی دبائی تحریک کو ان حضرات نے ایوب خان کے آخری دور میں حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اچھال دیا جو اس سے قبل کبھی اشتراکیت کی پر خلوص حمایت کرتے نظر نہیں آئے تھے۔ بلکہ نوجوان اور مزدور طبقوں اور غریب عوام کی بے چینی اور باغیانہ جذبات کا سہارا لے کر اقتدار کی کرسیاں حاصل کرنے راتوں رات اشتراکی بن بیٹھے، وہ ایک طرف تو نوجوان اور مزدور طبقات اور غریب عوام کی قوت سے بخوبی واقف ہیں تو دوسری جانب کسی اور تحریک یا جماعت میں انہیں اپنی جان نظر نہ آئی یا تائید کا امکان دکھائی نہ دیا کہ وہ کرسی اقتدار تک پہنچ سکتے۔ آج اشتراکی لیڈروں میں وہ بھی ہیں جو برسہا برس سے پاکستان کی آمرانہ اور انتہائی غیر جمہوری حکومتوں کے دستر خوان پر وزیر کی حیثیت سے روٹیاں توڑتے رہے اور عوام کو ان حکومتوں کی اطاعت کا درس دیتے رہے لیکن جب وہاں سے نکالے گئے تو بھیک کا ٹھیکرا لئے کبھی ملک امیر محمد خاں مرحوم نواب کالا باغ کے دستر خوان پر پہنچے، مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے در پر صدائیں دیں وہاں کچھ نہ ملا تو بکے ہوئے مشرقی پاکستان پہنچے اور ٹکا سا جواب لئے منہ بسورتے ہوئے لوٹے تو ہوائی اڈوں پر منڈلانے لگے۔ اور آخرکار اشتراکی لیڈر بن کر ابھرے تو اس انداز سے ابھرے کہ کہیں اشتراکیت کا دم بھر رہے ہیں کہیں اسلام کی حمایت کر رہے ہیں تو

کہیں علاقہ واریت کو ہوا دے رہے ہیں اور اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں ہیں، اشتراکیوں میں وہ بھی ہیں جو پچھلی آمرانہ حکومتوں کے تحت اعلیٰ عہدوں پر فائیز رہے نہ انہیں قبض ہوا اور نہ بدہضمی کی شکایت لیکن مدت ملازمت کی تکمیل اور وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہوتے ہی عوام کی بے کسی کا درد محسوس کرنے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ ان لیڈروں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو پچھلے برسوں میں مختلف جماعتوں کے دروازے کھٹکھٹائے اور کرسی ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور کہیں روزگار کی سبیل نہ پاکر آخرکار اشتراکی لیڈر بن گئے، ان میں وہ زمیندار بھی ہیں جن کے دامن غریب محنت کش کاشتکاروں کے لہو سے داغدار ہیں اور وہ سرمایہ دار بھی ہیں جو کل تک سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار تھے اور غریبوں کا لہو پیتے اور قومی مفادات کو پس پشت ڈال کر ذاتی مفادات کی تکمیل کا ساماں کرتے رہے۔ مختصراً یہ کہ اشتراکی تحریک کو مخلص قائدین نصیب ہی نہیں ہوئے جو حضرات آج اشتراکی لیڈر بنے پھر رہے ہیں وہ نوجوانوں، مزدوروں اور غریبوں کے جوش وخروش سے فایدہ اٹھاکر کرسی اقتدار کے حصول کی فکر میں ہیں نہ ان کا کوئی سیاسی کردار ہے اور نہ ان کی سیاسی زندگی میں ان کا کوئی ایک مقصد اور کوئی ایک پروگرام رہا ہے اور بیس بائیس سال سے معاشی حالات کی ابتری سے تنگ آئے ہوئے عوام اپنے جوش وخروش میں ہر اس آواز پر لبیک کہہ چلے ہیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے

پچھلے دور میں یہ آوازیں کس کس انداز سے کہاں کہاں سے سنائی دیتی رہی ہیں، اور ان آوازوں کی اصلیت کیا ہے، پھر اشتراکی لیڈروں کی ٹولی یہ خوب اچھی طرح سمجھ چکی ہے کہ اب عوام کو اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے ذاتی مفادات کے لئے بے وقوف نہیں بنایا جا سکے گا، اس صورت میں یہ ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوں گے اور انجام بڑا ہی درد ناک ہوگا، ایوب خان کی بنیادی جمہوریت آمرانہ حکومت کے تحفظ کے لیے ایک قلعہ ضرور تھی، لیکن عوام کے جوش غضب نے اس قلعہ کو مسمار کر کے رکھ دیا اسے دوبارہ تعمیر نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ وہ اشتراکی نظامِ حکومت میں اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کا سامان تلاش کر رہے ہیں، اشتراکی نظام دنیا کا واحد سیاسی نظام ہے جو آمرانہ طرزِ حکومت کو ایوب خان کی بنیادی جمہوریت سے کہیں زیادہ مستحکم اور محفوظ رکھتا ہے روس نے بڑے عرصے تک آہنی پردے کے سہارے دنیا کو بیوقوف بنایا لیکن آخر کار روس کے حالات دنیا کو معلوم ہو ہی گئے کہ ایک پارٹی کی حکومت اور مزدوروں اور عوام الناس کی حکومت کے نام پر اسٹالن روس کے کروڑوں عوام پر (۲۹) طویل برسوں تک ایک خونخوار درندے کی طرح مسلط رہا۔ اور اس کی خونخواریت کو کسی مغربی مصنف نے نہیں بلکہ اس کے جانشین خروشچوف ہی نے دنیا پر واضح کیا۔ جب روس کے بدترین حالات ساری دنیا پر آشکارا ہوئے تو اشتراکی حضرات نے اپنا قبلہ ماسکو کی بجائے پیکنگ کو قرار دیا۔ لیکن ۱۹۲۹ء سے آجتک یعنی

بیس سال سے وہاں بھی ماوزے تنگ اور ان کے حاشیہ نشین ہی
کرسیٔ اقتدار پر قابض ہیں، دھیرے دھیرے چین کے حالات سے
بھی پردہ اُٹھتا جارہا ہے روسی سامراج کی طرح جس نے یورپ میں
بدترین سامراجی سرگرمیوں کا مظاہرہ کر کے دُنیا کے اشتراکیوں کی
نگاہیں نیچی کر دیں۔ چینی سامراج بھی چین کے صدر لیو شاؤچی کو ٹھکانے
لگا کر اور کچھ احتجاجی عوامی تحریکوں کو کچل کر دُنیا میں چپکے چپکے نیک نام
ہو چلا ہے، اسٹالن اور ماؤزے تنگ کی طویل شخصی حکومتوں کی
بدترین صورت اشتراکیت ہی کے تحت ممکن ہے یہ واحد عوامی
نظامِ حکومت ہے جو عوام کے تمام بنیادی حقوق غضب کر کے ملک کو
ایک عوامی فلاحی مملکت بنانے کی بجائے ایک پولس اسٹیٹ ہی کی شکل
دیتا ہے اور اجتماعیت کے نام پر ملک عوام کے ایک فارم میں بدل دیا
جاتا ہے، جیسے پولٹری فارم، ڈیری فارم وغیرہ ہوتے ہیں، عوام اس
فارم میں جانور کی سی زندگی بسر کرتے ہیں اور انسان کو جانور سے زیادہ
اہمیت بھی نہیں دی جاتی، اختلافِ رائے کا حق انسانی آزادی کا بھرپور
اظہار ہے، سرمایہ دارانہ ممالک میں تو یہ حق عوام کو حاصل ہے اور اکثر
بڑی ہی شدت کے ساتھ اسے استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن اشتراکی
ممالک میں سب سے پہلے عوام اسی حق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں جب یہ
حق نہ رہا تو پھر انسانی فکر اور انسانی جد وجہد میں تنوع کہاں رہا انسانی
زندگی اسی تنوع سے تو عبارت ہوتی ہے، انسانی زندگی کی تمام تر

دلکشی اور سارا حسن اسی تنوع کا مرہونِ منت ہے ورنہ انسان اگر جانوروں کی طرح پیدا ہو کر اپنے پیٹ کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہوئے زندگی کے دن پورے کر کے دُنیا سے رخصت ہو جائے تو اس کی زندگی جانور سے بھی بدتر ہوگی، لیکن اشتراکیت کے علمبرداروں نے عوام الناس کو اسی سطح پر لا کھڑا کیا ہے، مغربی ممالک میں سرمایہ داری کی لعنتیں جو مختلف اداروں میں تقسیم ہو کر منتشر ہو جانے کی بنا پر عوام پر بھرپور انداز میں اثر انداز نہیں ہو سکتیں وہ تمام لعنتیں اشتراکی ممالک میں سمٹ کر حکومت کے ایوان میں مرکوز ہو جاتی ہیں اور حکومت کے سہارے بدترین انداز میں عوامی زندگی کو تہس نہس کرتی رہی ہیں، اشتراکی ملک میں کوئی سرمایہ دار نہیں ہوتا کہ روزی فراہم کرنے کے بہانے غریب کا خون چوسے لیکن وہاں حکومت سب سے بڑی اور واحد سرمایہ دار ہوتی ہے جو اپنے عاملانہ اختیارات کی بنا پر عوام کا حسب منشا استحصال کرتی ہے اور عوام گلی گلی اور کوچہ کوچہ پھیلے ہوئے پولیس اور جاسوسوں کے جال میں جکڑ کر اس قدر بے بس کر دیئے جاتے ہیں کہ سر کو پیر کی خبر نہیں رہتی۔ اسٹالین (۲۹) سال حکومت کریں اور خون کی ندیاں بہا دیں یا ماؤزے تنگ (۲۰) سال سے آقا بنے رہیں عوام کی بلا سے، انہیں تو اپنا تک ہوش نہیں، ہمارے نئے نویلے اشتراکی لیڈر بھی اسی لئے اشتراکیت کا پرچم اٹھائے مارے مارے پھر رہے ہیں کہ ایک بار عوامی جوش و خروش نے ان کو ایوانِ حکومت میں پہنچا دیا تو پھر برس ہا برس کی چھٹی — جانے

کیوں ہمارے پچھلے حکمرانوں کو یہ نہیں سوجھی ورنہ دیرپا اور مستحکم شخصی حکومت کے قیام کے لئے اشتراکیت سے بہتر کوئی اور نظام انسان رائج نہیں کر سکا ہے"۔

حالیہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد سے ہماری حکومت پُرخلوص جدوجہد کر رہی ہے کہ پاکستان کی ناؤ کنارے آ لگے، اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے کہ ایک ایسا دستور مرتب ہو کر نافذ ہو جائے جو پاکستان کے عوام کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہو، اور پاکستان کے سیاسی نظام کو استحکام نصیب ہو، اگر عوام نے مفاد پرست اور خود غرض عناصر کے فریب میں آ کر وقتی جذبات اور غیر دانشمندانہ جوش و خروش میں مبتلا ہو کر اس موقع کو کھو دیا اور غلط قدم اٹھایا تو آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی اور پاکستان وہ پاکستان نہ ہوگا جس کے قیام کے لئے ۱۹۴۷ء تک لاکھوں مسلمانوں نے جان دی اور ۱۹۶۵ء میں جنگی آبرو پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنی زندگی قربان کر دی، ایوب خان کے آخری دور میں ہمارے چند مفاد پرست سیاسی لیڈر عوام کے جوش و خروش کے سہارے سوشلزم کا نعرہ لگا کر جس تیزی سے ابھرے تھے، اب اسی سرعت کے ساتھ گمنام ہو چلے ہیں، عوامی ذہن سے ان کے خاکے محو ہوتے جا رہے ہیں یہ خاکے دیرپا اس لئے بھی نہیں ہو سکتے کہ ان خاکوں کی تشکیل ان حالات نے کی تھی جو ایوب خان کے آخری دور میں وقوع پذیر ہوئے تھے، کسی لیڈر کا سیاسی خاکہ جو مخصوص حالات

سے عبارت ہوتا ہے ان حالات ہی کے ساتھ محو بھی ہو جاتا ہے مارشل لار
کے نفاذ کے بعد حالات معمول پر آتے ہی ہمارے ہاں اشتراکی لیڈروں کے
نام کے دھندلے پڑنے لگے۔ کیونکہ ان لیڈروں کا کوئی سیاسی کردار
نہیں ہے اور سیاسی کردار کی عظمت ہی وہ چیز ہے جو عوامی ذہن میں
ایک لیڈر کا خاکہ زندہ رکھتی ہے اشتراکی حضرات کو اندیشہ ہے کہ اگر
انتخابات تک ان کے سیاسی خاکے عوامی ذہن سے محو ہو گئے اور پرانی
باتیں عوام کو یاد آ گئیں تو ایک بار پھر وہ راندۂ درگاہ ہو جائیں گے چنانچہ
وہ کوشاں ہیں کہ ان حالات کو برقرار رکھا جائے۔ جن کے سہارے
وہ ابھرے تھے، اپنے کارندوں کے ذریعہ مختلف بہانوں سے پاکستان
کے دونوں صوبوں میں وہ عوام کے مختلف طبقوں میں تخریبی سرگرمیوں
پر اکسا رہے ہیں، اگر عوام نے اس کھیل کو نہیں سمجھا اور آنکھیں بند کئے
ان مفاد پرستوں اور سیاسی قلابازوں کے اشاروں پر ناچنے لگے
تو ہم اپنی تباہی کا خود اپنے ہی ہاتھوں سامان کریں گے، اعتدال میں جوش
و خروش قومی مسائل کا دانشمندانہ حل تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے
لیکن اندھے جوش اور جذباتی ردعمل کی بنا پر آدمی ہمیشہ منہ کے بل ہی
گرا ہے، اپنے دوستوں کو جانئیے اور دشمنوں کو پہچانئیے۔ حضور اکرم
صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو یاد رکھئے۔

قریب ہے وہ زمانہ کہ اللہ کے باغی گروہ اور اسلام کی
دشمن قومیں تم کو ہڑپ کرنے کے لئے تمہارے حصے بخرے

کرنے کے لئے تمہاری ہڈیاں چبا جانے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح آواز دیں گی جیسے دسترخوان پر بیٹھی ہوئی جماعت اپنے بڑے پیالے پر اپنے ساتھیوں کو آواز دیتی ہے کہ یہاں آؤ یہاں تر نوالہ ملے گا اسی طرح سے تمہارے اوپر اللہ کی باغی قومیں یلغار کریں گی۔۔

پاکستان میں اسلامی تحریک

اگر گذشتہ بائیس سال میں ہمارے ارباب حکومت عوام الناس کے مفادات کے پیش نظر اور پاکستان کے قیام کے مقصد اور اس مقصد کے حصول کے لئے دی ہوئی عظیم قربانیوں کا احترام کرتے ہوئے اسلامی نظام قائم کرنے کی بجائے اپنے شخصی اور ذاتی مفادات کے حصول کے لئے ایک ایسے نظام کو استحکام دینے میں مصروف رہے جو مغرب کی سرمایہ دار جمہوری ممالک کے اور مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول نظام کا بدترین چربہ تھا اور صرف ایک آمرانہ طرز حکومت کے لئے موزوں اور معاون ہو سکتا تھا تو یہ نتیجہ کیوں کر اخذ کیا گیا کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام ناکام ہو گیا یا اسلامی نظام ہمارے ملک کے لئے موزوں نہیں ہے جب کہ پچھلی حکومتوں نے مسلسل بائیس ۲۲ سال تک سر توڑ کوشش کی ہے کہ اس ملک میں کہیں اسلامی نظام کے قیام کی تحریک پروان نہ چڑھ سکے

یہ حضرات اسلامی نظام سے کیوں خائف رہے ہیں اور اسلامی تحریک کو کچلنے کے لئے ان حکومتوں نے خصوصی حربے کیوں استعمال کئے اور طرح طرح کی غیر قانونی اور غیر معقول پابندیوں کو کیوں روا رکھا اور جب بھی ان پابندیوں کو عدالت العالیہ میں چیلنج کیا گیا، ان کی غیر آئینی اور غیر قانونی نوعیت ہی کی توثیق ہوئی۔ اس کے باوجود یہ حکومتیں باز نہ آئیں اور مسلسل درپے آزار رہیں، اگر اسلامی نظام کا نفاذ ان حکومتوں کے ارباب حل وعقد کے خود غرضانہ عزائم اور آمرانہ طور طریق سے متصادم نہیں تھا۔ تو پھر یہ ساری کارروائیوں کی ضرورت پیش کیوں آئی، اگر اسلامی نظام ان حالات ہی کو روا رکھتا ہے جن حالات میں خود غرض عناصر عوام الناس کے مفادات سے کھیلتے ہوئے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکتے ہیں تو پھر ان عناصر نے اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کو بار بار غیر آئینی اور ظالمانہ انداز میں کچلنے کی کوشش کیوں کی، اسلامی نظام کا راگ تو عوام کو بیوقوف بنانے اکثر جماعتوں نے اس دور میں مسلسل الاپا لیکن ملک میں جو حضرات خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ بے لوث انداز میں اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے رہے انہیں الزامات تراش تراش کر جیلوں میں کیوں بند کیا گیا۔ ان پر ایسی پابندیاں کیوں عائد کی جاتی رہیں جن کے تحت ایک جماعت اپنی معمولی سرگرمیوں کو جاری رکھنے سے تک معذور ہو جاتی ہے؟ جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم جیسی تخریبی تحریکوں کو اپنے مسائل کا حل سمجھ بیٹھے ہیں اور اکثر و بیشتر ان تحریکوں سے پوری طرح واقف

تک نہیں ہیں کیا اتنا بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کو اس لئے کچلا جا تا رہا کہ اسلامی نظام کے تحت نہ سرمایہ داروں کا گروہ غریب مزدور اور ملازم پیشہ طبقہ کی ہڈیاں چبا سکے گا نہ زمیندار کاشتکاروں کا خون چوس سکیں گے نہ اعلیٰ عہدیداروں کی ضیافتوں کا اہتمام ممکن ہوگا، نہ ناجائز دولت کا اجتماع ممکن ہوگا۔ غریب اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لئے دھکے نہیں کھا سکیں گے، ملاوٹ اور مصنوعی گرانی کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اسلام صرف استنجا، وضو، نماز اور روزہ نہیں ہے یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس طرح سوشلزم صرف روٹی اور کپڑے کا نام نہیں بلکہ ایک نظام ہے عوام نہ سوشلزم کو سمجھنے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ اسلام ہی کو جاننے کی زحمت گوارا ہے، انہیں سمجھا دیا گیا ہے کہ سوشلزم غریبوں کا نجات دہندہ اور اسلام سرمایہ داروں کا پشت پناہ ہے لیکن دنیا کے اشتراکی ممالک میں عوام الناس کی حالت تو اب راز نہیں رہی ہے اور یہ بھی کوئی افسانہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام کے حقیقی معنوں میں نفاذ نے عرب کے غریب، مفلس اور پسماندہ عوام ہی کو دنیا کی ایک عظیم طاقت بنا کر روم اور ایران جیسی قدیم اور پرشکوہ سلطنتوں کے مقابل کھڑا کر دیا تھا، اسلام نے عوام کو جکڑ کر سرمایہ داروں کو ان پر مسلط نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسلامی نظام اور اسلامی تحریک ہی عمر فاروقؓ جیسا عوامی حاکم جنم دے سکتی تھی کہ ساری دنیا کی قومیں جس کی عظمت کو تسلیم کرتی

آئی ہیں اور جو انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ حقیقی اسلامی نظام کو روئے زمین پر بمشکل تمام بارہ سال پھلنے پھولنے کا موقع ملا، خود غرض جاہ پسند اور مفاد پرست عناصر نے حضرت عثمان رضؓ بن عفان ہی کے دورِ خلافت سے اسلامی نظام کی بیخ کنی شروع کر دی تھی لیکن کبھی تو غور کیجئے کہ ان بارہ برسوں میں اسلامی نظام نے دُنیا کو کیا دیا اور گذشتہ پچاس برسوں سے اشتراکیت کا بول بالا ہے، لیکن یہ نظام دُنیا کو کیا دے سکا، اسلام پر یہ الزام تو بڑی خوبصورتی سے تھوپ دیا جاتا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو متحد نہ کر سکا، یہ درست ہے کہ آج مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان متحد نہیں ہیں لیکن وہاں اسلامی نظام بھی موجود نہیں ہے، وہاں اکثر ممالک جن کو مسلم ممالک کہا جاتا ہے عرب نیشنلزم کے نام سے یا کھلے بندوں سوشلسٹ ہیں اور سوشلزم نے وہاں ابھی ابھی رواج پایا ہے اور عروج پر ہے اس کے باوجود سوشلزم انہیں متحد نہ کر سکا۔ یہ ممالک سرد جنگ میں مبتلا ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا شکار رہیں، مشرقِ وسطیٰ سے قطعِ نظر دنیا کے بڑے سوشلسٹ ملک، روس، چین، اور یوگوسلاویہ آپس میں سرد جنگ میں مبتلا ہیں بلکہ چین اور روس کی سرحدوں پر تو کئی بار مسلح جھڑپیں ہو چکی ہیں، مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے پر روس اور چین کا تصادم ہوا، ویت نام میں روس اور چین کے انداز رقیبانہ ہیں حالانکہ ایک تیسرے اشتراکی ملک (شمالی ویت نام) کی مدد مقصود ہے۔ اقوامِ متحدہ میں عوامی جمہوریہ چین کی شمولیت پر روس کا نقطۂ نظر حریفانہ رہا ہے۔

یوگوسلادیہ کے صدر مارشل ٹیٹو آج غیر جانبدار ممالک کے ایک قابلِ احترام لیڈر ہیں، اسرائیل کے خلاف عرب ممالک سے روس کی تمام تر ہمدردی کو پکنگ ڈھونگ قرار دیتا ہے اور روس کو مغربی سامراجیوں کا ایجنٹ گردانتا ہے، کبھی ہمارے عوام ان حقایق کے اسباب و علل پر بھی تو غور کریں یہ بھی تو سوچیں کہ سوشلسٹ روس نازی حملے سے بوکھلا کر سامراجی ممالک (برطانیہ، امریکہ اور فرانس) کا حلیف کیوں بن بیٹھا تھا جب کہ روس میں اشتراکیت کے نفاذ کو بیس بائیس ۲۲ سال گذر چکے تھے، کیا اشتراکیت روس کے عوام اور وہاں کی حکومت کو اس عرصے میں اتنی استقامت بھی نہ دے سکی کہ وہ تنہا نازیوں کے خلاف ڈٹ جاتے جو پہلے ہی سے متعدد محاذوں پر نبرد آزما تھے، اگر نازیوں نے دوسرے ممالک سے جنگ کرنے کی بجائے صرف روس ہی کے خلاف ہتھیار اٹھائے ہوتے یا مغربی ممالک نے روس کو اتحادیوں میں شامل کرنے سے انکار کر دیا ہوتا تو روس کا کیا بنتا؟ اس کے برعکس اسلام نے عربوں کو بیس بائیس سال کی نصف مدت میں دنیا کی عظیم ترین طاقت بنا دیا تھا اور انہوں نے روم اور ایران جیسی قدیم اور طاقتور سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے تھے.

اور ابھی ستمبر ۱۹۶۵ء میں اسلام کے جذبے ہی سے سرشار ہو کر پاکستان کی مٹھی بھر فوج نے ہندوستان کی فوج کو اس کی تعداد اور آلات حرب کی کئی گنا کثرت کے باوجود اس انداز سے شکست دی کہ دنیا دیکھتی رہ گئی جبکہ اُدھر ایک ہی سال بعد مشرقِ وسطیٰ کے سوشلسٹ ممالک نے

اپنی کثرت کے باوجود اسرائیل کے مقابلے میں شرمناک شکست کھائی ان ممالک میں صرف اُردن کی فوج اسلام کے جذبے سے لڑی تھی اور اس انداز سے لڑی کہ دنیا کی حقیقت پسند قوموں کے علاوہ خود اسرائیل نے اس کی داد دی، کیا ہمارے عوام ان واقعات کو بھول بیٹھے ہیں، گذشتہ پچاس برسوں میں اشتراکی نظام دُنیا کی تاریخ کو ایک ایسا کردار نہیں دے سکا جس کی بے غرضی، خلوص اور انسانیت کی بے لوث خدمت کا جذبہ سارے انسانوں کے لئے مشعل راہ اور باعثِ افتخار ہوتا۔ اشتراکی نظام نے خونخوار درندوں ہی کو جنم دیا جو اپنی زندگی یا اپنے دورِ اقتدار میں خود ہی اپنی انسانیت پرستی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے لیکن جیسے ہی وہ مرے یا ان پر زوال آیا انھیں کے جانشینوں نے ان کی کھال ادھیڑ پھینکی اور دُنیا پر ان کا اصلی روپ ظاہر کردیا، اسلامی نظام نے بارہ سال ہی میں شہید کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام جیسے حق پرست، عمر فاروق رضؓ جیسے عوامی حکمراں اور خالد بن ولید جیسے سپہ سالار کو جنم دیا کہ جن کے کردار آج بھی اپنی مثال آپ ہیں اور جن کے عقیدت مند چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس حسینؑ کے کردار سے ہم فیضان حاصل نہ کریں جس نے صرف اتنی سی بات کے لئے کہ حق باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوگا اور صرف حق کی لاج رکھنے کے لئے اپنے ننھے بچوں اور معصوم بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ خود بھی اپنی جان قربان کر دی، اور اسٹالن کو اپنا پیرو

قرار دیں جو دنیا کے سب سے وسیع و عریض ملک کا سربراہ ہونے کے باوجود نازی حملے سے گھبرا کر ان کے در پر دستک دے بیٹھا جن کو وہ خود انسانیت کا دشمن سمجھتا تھا، اور ان سے معاہدے کر کے اپنی قوم کو ہمیشہ کے لئے ذلیل کر گیا، اس عمر فاروق رضی کو ہم فراموش کر بیٹھے جو کپڑوں میں دس دس پیوند لگائے کوڑا ہاتھ میں غلط کاروں کو ڈھونڈھتا ہوا مدینے کی گلیوں میں پھرتا تھا اور جس کی راستبازی اور دیانت داری سے ایک خلقت کانپتی تھی اور آج ان اشتراکی رہنماؤں کو ہم نے اپنا آئیڈیل بنالیا جو کل تک مظلوم انسانیت کے حامی کہلاتے تھے اور آج ان کو انھیں کے ساتھیوں نے کتے کی موت مار دیا اور جن کے ہاتھ انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، تاریخ اشتراکیت اٹھائیے اور اسلامی نظام کی تاریخ لیجئے۔ اور ان کے کرداروں کا تقابلی مطالعہ کیجئے، وہ کردار جن کی یاد نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے لہو کو گرمایا تھا اور حق کی خاطر جان کی بازی لگانے پر ابھارا تھا، وہ کردار جو حصول پاکستان کی صبر آزما کشمکش میں ہمارے مشعل راہ تھے، وہ کردار اسلامی نظام ہی کی تاریخ میں دھڑکتے ہوئے ملیں گے زندہ اور جاوید۔ ان کرداروں سے کروڑوں انسانوں کی آج عقیدت کس بنا پر ہے اور اپنے تاریخی کرداروں سے خود اشتراکی عوام کی نفرت کا سبب کیا ہے۔

سرخ چین شاہراہِ ترقی پر

یہ غلط ہے کہ ہمارے عوام سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یہ نظریہ ان حضرات ہی کا وضع کیا ہوا ہے جو اپنی آمرانہ حکومت کو عوام پر مسلط رکھنا چاہتے تھے۔ یہ اسی کوشش کا ردِ عمل ہے کہ ہمارے عوام الناس کے علاوہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی جذباتی انداز میں سوچنے لگا ہے، ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ عموماً اشتراکی چین کی ترقی کو اشتراکی نظام ہی کا کارنامہ خیال کرتا ہے، شایداس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا ہی نہیں گیا ہے ورنہ اشتراکی چین کی ترقی کے مشیا نظرا شتراکی نظام سے وابستہ خوش فہمیاں کب کی ختم ہو چکی ہوتیں حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی چین کی ترقی اشتراکی نظام کی بنا پر نہیں بلکہ دوسرے اسباب سے عبارت ہوئی ہے جن کا تعلق نہ اشتراکی نظام سے ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام سے، یہ اسباب خواہ بادشاہت کے تحت خواہ اشتراکی یا سرمایہ دارانہ نظام کے تحت بروئے کار آئیں، تو ترقی لازمی نتیجہ ہوگی چین کی جس ترقی کا بہت شہرہ ہے وہ مادی ترقی بلکہ آلاتِ حرب کے باب میں اس ملک کی ترقی ہے یعنی چین جس کو عموماً ایشیا کا ایک پسماندہ ملک خیال کیا جاتا رہا تھا۔ گذشتہ بیس سال میں اس نے مادی اعتبار سے عموماً اور آلاتِ حرب کے باب میں خصوصاً اس قدر ترقی کی ہے کہ اس کا شمار دُنیا کی ترقی یافتہ اور طاقتور قوموں میں کیا جا رہا ہے۔ یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے لیکن

اگر اس ترقی کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ ترقی دنیا کی تاریخ یا جدید تاریخ میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں نظر آئے گی، دوسری جنگ عظیم سے قبل فرانس کو یورپی ممالک میں ایک ایسا ملک سمجھا جاتا تھا جہاں کے عوام عیش و عشرت کے دلدادہ تھے جہاں نہ کوئی معقول سیاسی انتظام ہی موجود تھا اور نہ فرانس سامراجی ملک ہونے کے باوجود خارجی حملے کی صورت میں اپنی مدافعت کے لئے معقول طاقت رکھتا تھا۔ جس طرح اہل چین کو افیونی کہا جاتا تھا اس طرح اہل فرانس کو بھی عیش کا دلدادہ سمجھا جاتا تھا۔ یورپ میں اس کا موقف ایشیا میں ۱۹۴۹ء سے قبل کے چین سے کچھ مختلف نہ تھا، پہلی جنگ عظیم نے اس کی کمر توڑ دی تھی ۱۸۷۱ء سے تیسری ری پبلک کے تحت جو ترقی فرانس نے کی تھی، ساری برابر ہو گئی تھی، جو بیس لاکھ نوجوان مارے گئے اور دو ارب پونڈ اس لڑائی کی نذر ہو گئے تھے۔

اس ضرب کاری سے فرانسیسی قوم ابھی سنبھل نہیں پائی تھی کہ یورپ میں دوسری عالمی لڑائی چھڑ گئی فرانس پھر ایک بار ایک ظالم اور طاقتور حملہ آور سے دوچار ہوا، اس موقع پر فرانس نے جس شرمناک انداز میں شکست کھائی وہ دنیا کو ابھی یاد ہے جنگ کے اختتام کے بعد فرانس کے اقتصادی اور سیاسی حالات دگرگوں رہے اسی اثنا میں الجزائر اور ہند چینی میں تحریک آزادی نے سر اٹھایا چنانچہ ۱۹۵۸ء میں جب جنرل ڈیگال نے اقتدار سنبھالا، فرانس ایک عظیم قوم کہلانے کا کسی بھی اعتبار سے مستحق نہیں تھا، حالات کے پیش نظر ڈیگال نے امریکہ سے

بالواسطہ درخواست کی تھی کہ اشتراکی حملے کی صورت میں فرانس کو ایٹمی اسلحہ کی فراہمی کی ضمانت دی جائے اس درخواست کو رد کر دیا گیا، ڈیگال نے سنجیدگی کے ساتھ ایٹمی اسلحہ کی تیاری کی تدابیر کا آغاز کیا، ویسے فرانس، ایٹمی اسلحہ بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن فرانسیسی ہوائی فوج کے جنرل پایئر گیلا دس نے حالات کے پیش نظر بڑی شدت سے محسوس کیا تھا کہ فرانس کو ایٹمی اسلحہ کی تیاری سے غافل نہیں رہنا چاہیئے ان دنوں فرانس میں اس کے ہم خیال بہت ہی کم تھے اور حکومت تو اس طرف توجہ دینے پر آمادہ ہی نہیں تھی، ۱۹۵۶ء تک گیلا دس دوڑ دھوپ کرتا رہا، وزراء، عوامی نمائندوں، سینیٹ کے اراکین، فوج کے اعلیٰ افسران اور صنعتکاروں کو ہموار کرنے کی کوشش کرتا رہا، اس کی ناکامی کا سبب فرانس کے حالات تھے، فرانسیسی حکومت چین کی اشتراکی حکومت کی طرح TOTALITARIAN حکومت نہیں تھی کہ فرانس کے مادی وسائل کو مابعد جنگ تعمیراتی منصوبوں کے لئے استعمال کرنے کی بجائے ایٹمی اسلحہ کی تیاری کے لئے وقف کر سکتی اور عوام کی جانب سے کسی قسم کی مخالفت کا امکان نہ ہوتا۔ اس بنا پر گیلا دس کو ۱۹۵۶ء میں کہیں جا کر کامیابی ہو سکی جب فرانس کے وزیر اعظم زوکی مولیٹ نے حکم دیا کہ فرانس ایٹم بم بنائے، جون ۱۹۵۸ء میں جنرل ڈیگال نے بر سر اقتدار آتے ہی اس مقصد کے لئے خاطر خواہ رقوم کا بندوبست کیا یعنی ۱۹۵۸ء سے فرانس نے سنجیدگی کے ساتھ اس مہم کا آغاز کیا، ورنہ اگر امریکہ فرانس کو ایٹمی اسلحہ فراہم

کرنے کا ذمہ قبول کر لیتا تو ۱۹۵۸ء تک یعنی دو سال میں ایٹم بم بنانے کی فرانس میں جو تدابیر کی گئی تھیں، ترک کر دی جاتیں ڈیگال کو یہ دھن سوار تھی کہ فرانس ایک معمولی ملک کی بجائے ایک عالمی طاقت اور امریکہ، برطانیہ اور روس کی طرح ایک عظیم ملک سمجھا جائے صرف دو سال بعد سنہ ۱۹۶۰ء میں فرانس نے ایٹم بم کا تجربہ کیا اور چند ہی سال میں اس کا موقف اس قدر استوار ہو گیا کہ وہ مساویانہ سطح پر عالمی مسائل میں بڑی طاقتوں سے کھلے بندوں اختلاف کرتا ہے۔

ایٹمی اسلحہ کے باب میں امریکہ کی ترقی بھی حیرت انگیز رہی ہے۔ جرمنی جنگ کے آغاز سے پہلے ہی ایٹم بم اور ایسے ہلاکت خیز اسلحہ کی تیاری میں سرگرم تھا، اور امریکہ نے اس طرف ابھی توجہ نہیں دی تھی، اس صورت حال کے پیش نظر ہنگری کے دو سائنسدانوں نے جو جرمنی کی اس کوشش سے واقف تھے آئین سٹائین کی عظیم شخصیت کا سہارا لے کر یہ خبر امریکہ کے صدر فرانکلین ڈی روزویلٹ کو پہنچا دی، ان کا خیال تھا کہ سائنسدانوں کا یہ پیغام امریکی حکومت تک پہنچانے کے لئے آئین سٹائین سے بہتر شخصیت کسی اور کی نہیں تھی، چنانچہ ۲ر اگست ۱۹۳۹ء کو آئین سٹائین نے روزویلٹ کو خط لکھتے ہوئے متنبہ کیا کہ نازی کس قسم کی ہلاکت کا سامان کرنے میں مصروف تھے، پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ کا شعلہ بھڑکا، ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو روزویلٹ نے "کمیٹی آن یورے نیم" قائم کر دی، یہ ایٹمی اسلحہ کی جانب امریکہ کا پہلا قدم تھا

ابھی چھ سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۶ جولائی سنہ ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے پہلا ایٹمی تجربہ کیا جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ دوسری لڑائی کے بعد ہی سے روس اور امریکہ ایٹمی اسلحہ کی دوڑ میں مبتلا ہیں ایک طرف دُنیا کا عظیم ترین اشتراکی ملک ہے تو دوسری طرف دُنیا کا سب سے بڑا سرمایہ دار ملک، اندازہ یہی ہے کہ امریکہ روس سے آگے ہی رہا ہے جہاں تک خلائی مہمات کا تعلق ہے سنہ ۱۹۵۷ء ہی سے ساری دُنیا میں روس کی فضائی معرکہ آرائیوں کے چرچے رہے ہیں سنہ ۱۹۵۹ء میں روس نے لونک دوم کو چاند تک پہنچا دیا تھا ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۶۱ء میں روس نے یوری گیگارین کو زمین کے مدار میں پہنچا دیا تھا فضائی دوڑ میں امریکہ بعد میں آیا اور ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۶۲ء کو جان گلن کو زمین کے مدار میں پہنچا سکا، صدر جان ایف کینیڈی کے دورِ صدارت تک بھی روس اس دوڑ میں آگے تھا، روس تمام تر کارروائیوں کو صیغۂ راز میں رکھتا رہا ہے اس لئے ابھی تک نہ یہ معلوم ہو سکا کہ روس کب سے فضائی پروازوں کی تیاری کر رہا تھا، اس کے کتنے تجربات ناکام رہے ہیں امریکہ کے تمام فضائی پروگرام قبل از وقت اور بعض وقت تو برسوں اور مہینوں پہلے شائع کر دیئے جاتے ہیں چاند پر آدمی پہنچانے کا پروگرام امریکہ نے کوئی دو برس پہلے پیش کیا تھا، جولائی ۱۹۶۹ء سے پہلے ہی چاند پر آدمی اُتارنے کی تفصیلات شائع کر دی گئی تھیں، اپولو بارہویں کی نومبر کی پرواز کا پروگرام جولائی سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا تھا اور نومبر سنہ ۱۹۶۹ء میں امریکہ نے سنہ ۱۹۷۱ء تک اپنے فضائی پروگرام کا خاکہ دُنیا کو پیش کر دیا ہے

جبکہ روس کی فضائی کارروائیوں پر سرکاری رپورٹیں ان کارروائیوں
کے اختتام ہی پر آتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کارروائی
کا مقصد کیا تھا اور اس میں کامیابی ہوئی بھی یا نہیں ابھی کی تو بات ہے جولائی
۱۹۶۹ء میں امریکہ کے اپولو یازدہم کے ساتھ روس نے لونا پندرہ چاند
پر روانہ کیا جس کی پرواز کا مقصد قطعی طور پر راز رہا اور ابھی تک راز
ہے لونا چاند پر گر کر تباہ ہو گیا تو روس کی جانب سے اعلان کر دیا گیا کہ وہ
اپنا مشن پورا کر چکا تھا جب تک لونا پرواز کرتا رہا ساری دنیا کے
سائنسدان اس کے متعلق طرح طرح کے اندازے لگاتے رہے روس ایک
غیر متعلق تماشائی کی طرح چپ رہا، آج بھی دنیا لاعلم ہے اور اس بنا پر لونا
کے مشن کی روس کی جانب سے اعلان کردہ کامیابی مشکوک ہے ۱۱ اکتوبر
میں روس نے پھر ایک فضائی تجربہ کیا جس کے متعلق حسب عادت
روایتی تفصیلات نہ دی گئیں لیکن دنیا نے محسوس کر لیا کہ یہ مشن ناکام رہا
اس ناکامی کی توثیق اس طرح ہوئی کہ فوراً بعد روس کی جانب سے اعلان
کر دیا گیا کہ چاند پر آدمی اتارنے کا پروگرام روس نے غیر معینہ مدت کے لئے
ملتوی کر دیا ہے، اس "راز داری" سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ روس کو
ابھی تک اپنی سائنسی کارروائیوں پر اعتماد نہیں ہے اور ناکامی کے ڈر
سے روس اپنی ہر کارروائی کے مقاصد کو راز رکھتا ہے "تاکہ بین الاقوامی
سطح پر اس کا IMAGE داغدار نہ ہونے پائے سارے ہی
اشتراکی ممالک کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ پراپیگنڈے کے سہارے جو

IMAGE وہ قائم کرتے ہیں اندرونی حالات کی پردہ داری ہی کے ذریعہ کو برقرار رکھتے ہیں۔

چین نے پہلا ایٹمی تجربہ ۱۹۶۴ء میں کیا تھا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چین سب سے ایٹم بم بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بہرحال اتنا عرصہ تو ضرور لگا ہوگا جتنا فرانس کو درکار ہوا تھا۔ پہلے ایٹمی تجربے میں چین کو جتنا وقت درکار ہوا، اس کا اندازہ بعد کے تجربات کی رفتار سے کیا جاسکتا ہے وہ پہلا تجربہ ہی ہے جس کے لئے وقت اور محنت کے علاوہ بار بار ناکامیوں کے باوجود مسلسل تگ و دو کی ضرورت پڑتی ہے بعد کے ارتقائی تجربات کو نہ اس قدر وقت چاہیے اور نہ محنت، گذشتہ پانچ سال میں ایٹمی اسلحہ کے باب میں چین کی ترقی کے پیش نظر یہ قرین قیاس ہے کہ پہلے تجربے کو کم سے کم پانچ سال درکار ہوئے اسکے علاوہ امریکہ کی ایٹمی توانائی کمیٹی کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر ڈاکٹر رالف ای لیپ کے الفاظ میں:

"چین کو وہ دشواریاں پیش نہیں آئیں جن سے امریکہ دوچار ہوا تھا، ان کارروائیوں سے جو ایٹمی اسلحہ کے سلسلے میں امریکہ نے ۱۹۴۵ء کے بعد کی تھیں، استفادہ کرتے ہوئے چین زیادہ آگے بڑھ سکا ہے، ہماری تحقیقات سے اسے کچھ فائدے ضرور پہنچے ہیں۔"

(ہفتہ وار لائف نیویارک ۲۸ رمئی ۱۹۶۹ء)

یہ خیال کہ چین کی اسلحہ کی حد تک ترقی کا دارومدار اشتراکی نظام پر ہے

اس بنا پر غلط ہے کہ اگر انقلاب سے قبل چین میں ذہین دماغ موجود نہیں تھے تو انسانی عمر اور ذہنی بالیدگی کی مخصوص مدت کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے کہ چین انقلاب (سنہ ۱۹۴۹ء) کے ابتدائی دس سال میں اشتراکی نظام کے تحت ذہین دماغ پیدا کر سکتا اور سنہ ۱۹۶۴ء میں اندازاً چار پانچ سال کی کوشش کے بعد ایٹم بم کا کامیاب تجربہ کر سکتا۔ ڈاکٹر مارٹن سمر فیلڈ نے جو پرنسٹن یونیورسٹی میں "ایروسپیس پراپلژن" کے پروفیسر رہے ہیں، لکھا ہے۔

"متعدد چینی طلبا، پروفیسروں اور انجینئروں سے گزشتہ تیس سال کے دوران اپنے روابط کے پیش نظر میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سوچنا فاش غلطی ہوگی کہ وہ میزائل پر کارگر تحقیقات اور میزائل کے ارتقا اور تیاری کا منصوبہ بنانے سے قاصر رہیں گے اور اس منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکیں گے" (سنہ ۱۹۶۵ء)

یعنی ڈاکٹر سمر فیلڈ نے انقلاب سے پندرہ سال قبل چین کے پروفیسروں اور انجینئروں میں وہ صلاحیتیں دیکھی تھیں جن سے استفادہ کرتے ہوئے وہ میزائل بنا سکتے تھے اس بنا پر بھی یہ خیال بے بنیاد ہے کہ اشتراکی نظام نے چین کو ذہین دماغ دیئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی نظام نے قومی صلاحیتوں کو مجتمع کر کے ایک مقصد کے حصول کے لئے راہ پر ڈال دیا ہے، دوسری عالمی جنگ میں تباہی

کے بعد فرانس میں بھی یہی ہوا ہے حالانکہ وہاں اشتراکی نظام موجود نہیں ہے، لیکن فرانس کی عالمی حیثیت کسی طرح چین کی حیثیت سے کم نہیں ہے حالانکہ چین نے ۱۹۴۹ء سے تعمیر نو کا آغاز کیا، اور فرانس نے ڈیگال کی سرکردگی میں ۱۹۵۸ء سے، دوسری عالمی جنگ میں جرمنی بالکل تباہ کر دیا گیا بلکہ اس کے برابر کے دو ٹکڑے ہو گئے جو ایک دوسرے سے، غیر معینہ مدت کے لئے علیحدہ کر دیئے گئے جاپان بھی اس جنگ میں اس قدر تباہ ہو گیا تھا کہ اس کے مستقبل سے عموماً مایوسی پائی جاتی تھی۔ لیکن اسلحہ کی تیاری سے قطع نظر آج مغربی جرمنی اور جاپان نے حیرت انگیز ترقی کی ہے یورپ میں آج مغربی جرمنی ایک عالمی حیثیت کا صنعتی ملک ہے جبکہ مشرق میں جاپان کی صنعتیں امریکہ کی صنعتوں کو للکار رہی ہیں، حالانکہ نہ مغربی جرمنی میں اشتراکی نظام رائج ہے اور نہ جاپان میں، چین کی طرح مغربی جرمنی، فرانس اور جاپان میں ان ممالک کی حکومتوں نے مادی ترقی کے لئے ملک کے تمام تر وسائل کو مجتمع کرکے تعمیر نو کا اہتمام کیا اسے کسی مخصوص نظام کا کارنامہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہٹلر کے تحت جرمنی نے پہلی عالمی جنگ میں تباہ ہو جانے کے باوجود بیس سال کی قلیل مدت میں اس قدر ترقی کی تھی کہ اس نے ساری دنیا کو جھنجوڑ ڈالا۔ جرمنی اور روس کا مقابلہ بھی دلچسپ ہے دونوں ممالک میں ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ نئی تنظیموں نے جنم لیا ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی نظام نافذ ہوا، اور روس جو افلاس

انتشار اور تباہی کا شکار تھا اور جسے پہلی جنگ عظیم نے خاصا نقصان پہنچایا تھا، شاہ راہِ ترقی پر گامزن ہوا، جبکہ جرمنی کو ۱۹۱۸ء میں شکست کھانے اور تباہ ہونے کے کئی سال بعد نازی تحریک کے تحت ترقی کرنے کا موقع مل سکا، اسکے باوجود جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو جرمنی جیسے چھوٹے سے ملک کے مقابلے میں روس جیسا وسیع و عریض اشتراکی ملک پسپا ہوتا گیا حتیٰ کہ نازی فوجیں لینن گراڈ تک پہنچ گئیں اور روس کی اشتراکی حکومت اسٹالن کی قیادت میں ماسکو سے بوریا بستر سمیٹ کر پناہ کی تلاش میں اندرونِ ملک کوچ کر گئی۔ ہر دور اور ہر نظام کے تحت قوموں کی ترقی کا راز یہی رہا ہے کہ قومی وسائل اور قومی صلاحیتوں کو موثر انداز میں کسی راہ پر لگا دیا جائے اسلام کے ابتدائی دور میں عربوں کی ترقی کا راز یہی تھا اور دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کی سرعت سے زوال پذیری کا سبب بھی یہی ہے کہ وہاں ایسی حکومت اب تک قائم نہیں ہو سکی جو استوار ہو، اور قوم کو ایک راہ پر ڈال سکے؛ فرانس میں بھی ۱۹۵۸ء تک اسی بنا پر تعمیر نو کے کسی منصوبے پر خاطر خواہ عمل درآمد نہیں ہو سکا تھا لیکن جیسے ہی ڈیگال کے تحت وہاں ایک مستحکم حکومت قائم ہوئی فرانس دس سال کی قلیل مدت میں کہاں سے کہاں جا پہنچا کہ اسے نظر انداز کر کے دنیا کی بڑی قومیں کسی عالمی مسئلہ کا حل تلاش کرتے ہوئے جھجکتی ہیں یہاں یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اشتراکی ملک میں ایک پارٹی کی TOTALITARIAN حکومت ہونے کی بنا پر قومی تعمیر وترقی

کے منصوبے آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچائے جا سکتے ہیں جبکہ فرانس، مغربی جرمنی اور دوسرے جمہوری ممالک میں جہاں جماعت سازی اور اختلاف رائے کی بھرپور آزادیاں عوام کو حاصل ہیں کسی ایک جماعت کا تعمیری منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا بے حد دشوار ہوتا ہے۔

برطانیہ میں کسی پارٹی کی حکومت دوسری عالمی جنگ کے بعد سے اب تک اس دشواری پر غالب نہیں آ سکی ہے اس طرح اشتراکی نظام کے تحت چین اور روس کی ترقی دوسرے جمہوری ممالک کی برابر بلکہ وسیع تر پیمانے پر ایک ہی عرصے میں ترقی کے مقابلے نہ کوئی غیر معمولی کارنامہ قرار دی جا سکتی ہے اور نہ اسے اشتراکی نظام کی برکت اور فیض کہا جا سکتا ہے۔ اس پہلو سے قطع نظر کسی نظام کے تحت کسی قوم کی حقیقی ترقی کا اندازہ اس قوم کی مجموعی مادی ترقی سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان نے آزادی کے بعد سے آج تک مادی اعتبار سے قابل داد ترقی کی ہے۔ پنڈت نہرو کی قیادت میں ہندوستان ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے باوجود ہندوستان کا شمار ترقی یافتہ اور عظیم ممالک میں نہیں ہوتا ہے جس کا سبب وہاں کے عوام کا افلاس، بے روزگاری ضروریاتِ زندگی کی گرانی اور کمیابی، نظام حکومت اور مختلف منصوبوں سے عوام کی بے دلی اور بے اطمینانی اور ایک شہری کے لئے آزادانہ زندگی بسر کر سکنے کے مواقع کا فقدان ہے ہندوستان میں عوام الناس کو اختلاف رائے کی بے پناہ آزادی حاصل ہے یہ آزادی دنیا کے چند ترقی یافتہ

ممالک کے سوا دوسرے ممالک میں ناپید ہے، اس کے باوجود ہندوستان میں کانگریس کو ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کے مواقع ملے لیکن حکومت اپنے عوام کو اقتصادی الجھنوں سے خاطر خواہ طور پر نجات نہ دلا سکی۔ ہندوستان ہی کیا، کوئی ملک مادی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کرلے اگر وہاں کے عوام خوشحال نہیں ہیں انہیں بنیادی حقوق اور اساسی آزادیاں حاصل نہیں ہیں آزادانہ طور پر زندگی بسر کرنے کے مواقع انہیں نصیب نہیں ہیں اور اگر ملک کا نظام فرد کے حقوق کے تحفظ میں کامیاب نہیں ہے تو ہم اسے ایک عظیم اور ترقی یافتہ ملک نہیں کہیں گے، نہ اس ملک کے نظام کو ایک کامیاب نظام کہا جاسکے گا۔ دنیا کے کئی ترقی یافتہ ممالک اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے اور روس اور چین بھی شامل ہیں، جہاں امریکہ کا جمہوری نظام ابھی تک اپنے عوام کو نسلی امتیازات سے بلند نہیں کرسکا ہے، جہاں دولت کی حیرت انگیز فراوانی کے باوجود افلاس اور بے روزگاری کی بدترین پرچھائیاں دکھائی پڑتی ہیں اور جہاں جرائم کی کثرت اور طلبا کی بے چینی تشویشناک صورت اختیار کرچکی ہے وہاں روس اور چین سرے ہی سے فرد کے وجود کے منکر ہیں اور فرد کے بنیادی حقوق اور اساسی آزادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں اور افراد کی تمام تر زندگی اور وجود کی اجارہ دار حکومت ہی قرار پاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام جہاں ناقابلِ قبول ہے اور انسانیت کی فلاح کے پرخلوص اور دیانت دار حامی جہاں اس جمہوریت کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ناممکن پاتے ہیں وہاں

اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے کہ انسانی مزاج جس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانوں کو جانوروں کی طرح لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا پولٹری فارم اور ڈیری فارم کی طرح انسانوں کے فارم انسانی فلاح کی ضمانت نہیں ہو سکتے اشتراکی ممالک وسیع پیمانے پر خرکاروں کے کیمپ ہیں جو جدید انداز پر چلائے جا رہے ہیں، اشتراکی ممالک میں عوام الناس ایک مخصوص نظریات کے حامل چند لوگوں کی ایک جماعت کی غلامی کا شکار ہیں یہ آمریت کی بدترین شکل اور عہد ماضی کی ظالم اور جابر بادشاہتوں کا جدید ایڈیشن ہے۔ ان نظام ہائے حکومت کے لئے انسان جانور ہی ہے۔

اشتراکی معاشرہ میں فرد

کئی ایک اعتبار سے انسان جانوروں سے مماثلت رکھتا ہے جانور جنگل میں آزادانہ طور پر وحشیانہ زندگی بسر کرنے کے باوجود چند قوانین کی پابندی کرتے ہیں ہر درندے کا اپنا ٹھکانہ، اور گشت پر نکلنے کا ایک وقت اور ایک RANGE ہوتا ہے اس RANGE میں وہ بالکلیہ طور پر آزاد اور خود مختار ہوتا ہے یہی آزادی اور خود مختاری اس کی شخصیت کے سارے پہلوؤں کو بھارتی ہے اسی طرح ہر انسان - فرد - ایک ملک اور ایک سماج میں زندگی بسر کرتا ہے یوں زندگی بسر کرتے ہوئے وہ فطری تقاضوں کے تحت اپنی شخصیت کے بھرپور اظہار کے لئے

جس کے بغیر اسے حقیقی مسرت نصیب نہیں ہوتی اور وہ ....
SENSE OF WHOLESOMENESS
سے محروم رہ جاتا ہے اُسے ایک ایسے SPHERE کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جہاں اس کی آزادی اور خود مختاری مسلّمہ ہو جہاں اسے اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی حاصل ہو لیکن اس SPHERE کے تحفظ اور دوسرے افراد کی جانب سے بے جا مداخلت کے سدباب کے لئے وہ دوسرے افراد سے سمجھوتہ کرتا ہے جو اس کے آس پاس رہتے بستے ہیں یہ سمجھوتہ ایک ذہنی خاکہ (UNDERSTANDING) ہے جو سماج کی تشکیل کرتا ہے اور اخلاقی اصول و ضوابط جنم لیتے ہیں، چونکہ ایک فرد دوسرے افراد سے ملے جلے بغیر زندگی نہیں بسر کر سکتا، نہ فرد انفرادی طور پر اپنی ضروریات اور احتیاجات کی تکمیل کا سامان کر پاتا ہے اور نہ زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور چونکہ انفرادی زندگی کو بہتر اور حسین بنانے کے امکانات افراد کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہوتے اس لئے تعاون عمل کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ افراد کے مابین مختلف مقاصد کے حصول کے لئے تعاون عمل باہمی کشمکش کو جنم دیتا ہے افراد کا باہمی تعاون اور ساتھ ہی باہمی کشمکش انسانی فطرت کا خاصہ ہیں۔ ان دونوں متوازی صورتوں کو تدریج کے ذریعہ متوازن رکھنے کے لئے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو سماج اور اخلاقی اصول و ضوابط کی طرح ایک ذہنی سمجھوتے پر مبنی نہ ہو بلکہ تمام

افراد سے بالاتر ہو، اور تمام افراد اسے اسکی اس حیثیت کے ساتھ تسلیم کرتے ہوں اور جو بااختیار ہو یعنی انحراف کی صورت میں وہ کسی فرد سے باز پرس اور اس انحراف کے خلاف کارروائی کرنے اور آئندہ ایسی صورت کا سدباب کرنے کا اختیار رکھتا ہو اور ان اختیارات کو کسی منحرف فرد یا کئی افراد کے خلاف استعمال کرتے ہوئے اسے دوسرے تمام افراد کی "تائید حاصل ہو، ایک ایسا ادارہ جو افراد کے باہمی تعاون کے لئے بہتر مواقع فراہم کرے، اور ان کے تعاون کو صحت مند بنیادوں پر برقرار رکھ سکے، حکومت ہے جو درحقیقت فرد کی داخلی اور فطری خواہشات کا مظہر ہے حکومت بادی النظر میں تمام افراد یعنی قوم سے متعلق ہوتی ہے لیکن دراصل اس کا بنیادی مقصد ہر فرد کی اپنی انفرادی زندگی بسر کرنے کے لئے اس کے اپنے انفرادی SPHERE کا تحفظ اور بہتری ہے جہاں فرد دوسرے افراد کے ایسے ہی ... SPHERES پر تجاوز کئے بغیر آزادی کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، اس انفرادی SPHERE کی مدافعت اور تزئین کا حکومت ایک ذریعہ ہے جو افراد کے معاشی، معاشرتی ثقافتی، تمدنی اور اس نوع کے مقاصد کے حصول کے لئے باہمی تعاون عمل کی بہتر سے بہتر صورت پیدا کرنے اور ان صورتوں کا تحفظ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور اس باہمی جدوجہد میں انہیں کامیابی کے مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ کسی دوسرے ملک سے تجارتی معاہدے کی صورت میں ہو، خواہ کسی دریا پر بند باندھ کر نہروں کے ذریعہ

آبپاشی کا منصوبہ ہو خواہ تعلیمی اداروں کا قیام ہو، سماج میں بلکہ اجتماعی سطح پر انسان کی تمام تر جد وجہد کا مقصد ہی اس انفرادی SPHERE کا تحفظ اور تزئین ہے اور ہر فرد کا دوسرے تمام افراد کے SPHERES کے لئے اپنے SPHERE کی طرح خلوص سے سوچنا اور ان کا احترام کرنا انسانیت ہے تمدن کا نقطۂ آغاز ہے اور یہیں سے افراد کے انفرادی لیکن مشترک مقاصد اور اقدار قومی ایک جہتی کو جنم دیتے ہیں اور یہ مقاصد قومی مقاصد اور یہی اقدار قومی اقدار قرار پاتے ہیں، چونکہ یہ قومی مقاصد اور اقدار انفرادی مقاصد اور اقدار بھی ہوتے ہیں اس لئے ان کی خاطر فرد وقت پڑنے پر جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتا جس قوم کے اجتماعی مقاصد اس قوم کے افراد کے انفرادی مقاصد سے جدا ہوں گے اس قوم سے ان قومی مقاصد کے حصول کے لئے پرخلوص جد وجہد یا ایثار کی توقع ہی عبث ہے، ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان کا ہر فرد بڑی سے بڑی قربانی کے لئے اسی لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اس کے قومی SPHERE کے ساتھ اس کے انفرادی SPHERE کو چیلنج کر دیا گیا تھا جبکہ دوسری طرف ہندوستان حملہ آور تھا یہ حملہ قومی سطح پر سوچا گیا تھا انفرادی SPHERE میں فرد نے اس حملے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی اور نہ حکومت نے فرد کو لاشعوری طور پر اس ضرورت کا احساس دلایا تھا۔ انسان ہی نہیں جانور تک آزادی پسند ہوتے ہیں، اگر فرد کو زندگی بسر کرنے کے لئے دوسرے افراد کا تعاون درکار نہ ہو تو اس کی آزادی ہمہ گیر اور

اس کا SPHERE لامحدود ہوگا لیکن چونکہ انسانی سماج کے بغیر انسان فطری طور پر زندگی نہیں بسر کر سکتا اس لئے دوسرے افراد کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی صورت میں فرد کا SPHERE محدود ہو جاتا ہے لیکن اس محدود SPHERE میں اس کی آزادی اور خودمختاری فطری تقاضوں کے پیش نظر ہمہ گیر اور لامحدود ہونے کی بنا پر ہی فرد کو زندگی کی حقیقی مسرتیں - اپنی شخصیت کا بھرپور اظہار اور SENSE OF WHOLESOMENESS حاصل ہو سکتی ہیں اس SPHERE میں زندگی بسر کرتے ہوئے فرد اپنی شخصیت کی تکمیل اور آزادی اور خودمختاری کے فطری تقاضوں کی تشفی حاصل کرتا ہے۔ وہ جو چاہے پیشہ اختیار کرے، وہ اپنی آمدنی جس طرح چاہے صرف کرے، جس طرح چاہے زندگی بسر کرے، جو عقیدہ چاہے رکھے، جس جماعت سے چاہے وابستہ ہو، وہ اس SPHERE میں بادشاہ ہوتا ہے۔ یہ SPHERE ہر فرد کا گویا DIVINE RIGHT اور اس کی فطرت کا حقیقی آئینہ دار ہے انگلستان کے شاہ جیمس اول نے (DIVINE RIGHTS OF KINGS) تو ڈھونڈ نکالا تھا لیکن اس کا ذہن ...

DIVINE RIGHTS OF INDIVIDUALS

تک رسائی نہ پا سکا۔ جیمس ہی کا کیا ذکر دنیا کی اکثر بادشاہتیں اسی بنا پر زوال پذیر ہوئیں کہ وہ انفرادی مقاصد اور قومی مقاصد میں مماثلت پیدا نہ کر سکیں، اشتراکی نظام نے فرد سے اس کا اپنا SPHERE چھین لیا ہے۔ حکومت فرد کی خواہش کا اظہار ہونے کی بجائے فرد کی زندگی حکومت

کی خواہش کی تابع ہو گئی صرف حکومت ہی فرد پر مسلط (SUPERIMPOSE) نہیں کی گئی بلکہ اس مسلط حکومت نے فرد پر اپنے مقاصد بھی مسلط کر دیئے اور چونکہ فرد انسانی فطرت کے تحت ان مقاصد کے حصول کے لئے جی جان سے کوشش نہیں کر سکتا اور ان مقاصد کی لگن نہیں رکھ سکتا جو اس کے اپنے عقائد، نظریات اور جذبات کی پیداوار نہ ہونے کی بنا پر اس کی اپنی شخصیت کا جزو نہیں ہوتے ہیں چنانچہ ایسے مسلط کردہ مقاصد کے حصول کے لئے فرد میں جذبہ (INNER URGE) کا فقدان پایا جاتا ہے اور چونکہ اس جذبہ کی غیر موجودگی میں ان مقاصد کے لئے کدوکاوش پر فرد کو آمادہ کرنے خارجی دباؤ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسی بنا پر اشتراکی ممالک ممالک میں افراد کے ساتھ محکمہ پولیس کے ہرکارے اور جاسوس سائے کی طرح لگے رہتے ہیں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مخبری ہر فرد کا قومی فرض قرار دیا گیا اور اس فرد کو مجرم کے برابر سزا کا مستوجب قرار دیا گیا جو کسی دوسرے فرد کے کسی جرم کی متعلقہ محکمے کی اطلاع دینے سے گریز کرے، اشتراکی ممالک میں جرم کا اپنا معیار ہے حکومت یا حکومت کے کسی کارندے کے خلاف کچھ کہنا ایک سنگین جرم ہے، اس طرح سارا ملک ایک CONCENTRATION CAMP ہو کر رہ جاتا ہے جہاں حکومت ہی حرف اوّل اور حرف آخر ہے اور فرد کو حکومت کی خواہش کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہاں یہ نہیں فراموش کیا جانا چاہیئے کہ اشتراکی تحریک اکثر عوام کے جذبات

کی ترجمان، ان کی خواہشات کی علمبردار، ان کی فلاح و بہبود کی ضامن اور امن، انصاف اور آزادی کی پرجوش حامی بن کر ابھری اور جیسے ہی اسے کامیابی نصیب ہوئی اس تحریک کے علمبرداروں نے دیکھتے ہی دیکھتے آمرانہ طرز عمل اختیار کیا اور عوام بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے بلکہ عوام کے یہ سچے نمائندے اور انسانیت کے درد سے تڑپ تڑپ اٹھنے والے یہ مخلص کارندے اقتدار سنبھالتے ہی ایک دوسرے کے آمرانہ طرزِ عمل کی بنا پر آپس میں الجھ پڑے۔ ۴ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء کو انقلاب روس کے "رہنما" لینن نے اپنی . . . TESTAMENT میں اسٹالن کے متعلق جو روس کی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری اور انقلابی سرگرمیوں میں لینن کا دست راست تھا حسب ذیل نوٹ لکھا۔

"اسٹالن انتہائی تند مزاج ہے (TOO RUDE) یہ صفت اگرچہ ہم کمیونسٹوں کی حد تک قابلِ قبول ہے لیکن جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز شخص میں یہ صفت ناقابل قبول ہے، لہٰذا میں کامریڈوں کو تجویز کرتا ہوں کہ وہ اسٹالن کو اس عہدے سے برطرف کرنے کی راہ تلاش کریں. . . یہ ایک معمولی سی غیر اہم بات نظر آئے گی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپس میں تفریق کے سدِ باب کی غرض سے اور اسٹالن اور ٹراٹسکی کے

تعلقات کے پیش نظر جن سے میں ابھی ابھی بحث کر چکا ہوں، یہ ایک معمولی اور غیر اہم بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی معمولی بات ہے جو قطعی اہمیت اختیار کر سکتی ہے"

۵ مارچ ۱۹۲۳ء کو لینن نے اسٹالن سے اپنے تمام ذاتی اور رفیقانہ (COMRADELY) تعلقات منقطع کر لئے۔ یہ انقلاب کے ابتدائی چند برسوں میں لینن اور اسٹالن کا عالم رہا۔ ادھر روس میں بالشویک بغاوت کے دو ہی ہفتے بعد قدیم بالشویک اور لینن کے بے تکلف دوست میکسم گورکی نے ۲۱ نومبر ۱۹۱۷ء کو اپنے جریدے NOVAYA ZHIZN میں لینن کے متعلق لکھا۔

" اندھے جنونی اور بے ایمان مہم پسند (عناصر) " اشتراکی انقلاب " کی جانب سر کے بل دوڑے جا رہے ہیں درحقیقت یہ راہ افراتفری کی راہ ہے پرولتاری سماج اور انقلاب کی تباہی کی راہ ہے مزدور طبقہ اس حقیقت کو جانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ لینن اس کے (مزدور طبقے کے) لہو سے تجربہ کرنے چلا ہے اور پرولتاریوں کی انقلابی کیفیت، مزاج پر یہ دیکھنے کے لئے آخری حد تک دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا" مزدور طبقہ کو چاہیے کہ وہ مہم پسند دیوانوں کو ان اہانت آمیز، احمقانہ اور

خونیں جرائم کی ذمہ داری پرولتاری سماج پر تھوپنے
کی اجازت نہ دیں جن (جرائم) کے لئے لینن کو نہیں بلکہ
پرولتاری سماج کو جوابدہ ہونا پڑے گا"۔

یہ اس میکسم گورکی کے الفاظ ہیں جسے سوویت روس آج ایک عظیم روسی مصنف اور لینن کے قابلِ فخر دوست کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اور اسکے ناولوں اور کہانیوں کے مجموعے لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے کوڑیوں کے دام ہر طرف بکھیر رہا ہے، گورکی کے الفاظ میں "اندھے جنونی اور مہم پسند دیوانوں کے اہانت آمیز، احمقانہ اور خونیں جرائم" کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن سر فہرست یہی جرم ہے کہ اشتراکیوں نے فرد کی زندگی اور اس کے انفرادی SPHERE کا خاتمہ کر دیا فرد کی شخصیت تشنۂ تکمیل رہ گئی ساری دنیا میں ایک بے اطمینانی اور بے چینی کا سبب یا تو اشتراکی ممالک کی طرح اس انفرادی SPHERE کا سرے ہی سے خاتمہ ہے یا پھر انفرادی SPHERE اور قومی SPHERE کے مابین ہم آہنگی کا فقدان ہے جس کی مثال ہمارے مغربی سرمایہ دار ممالک ہیں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ قومی SPHERE انفرادی SPHERE ہی کے مشترک عناصر سے عبارت ہوتا ہے افراد کے مشترک مفادات، مقاصد اور اقدار ہی کو قومی مفادات مقاصد اور اقدار کا مرتبہ حاصل ہونا چاہیئے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے تحت حکومتیں افراد کے باہمی تعاون عمل اور باہمی کشمکش میں جن کا انسانی سماج میں پایا جانا لازمی اور فطری ہے۔

جانب دارانہ طرزِ عمل اختیار کر کے باہمی کشمکش کے اثرات سے ضروری حد تک محفوظ رکھتے ہوئے اجتماعی تعاونِ عمل سے زیادہ اور غیر منصفانہ فائدہ اٹھانے کے مواقع چند افراد کو فراہم کرتی رہی ہیں، باہمی تعاونِ عمل اور باہمی کشمکش کی تبدیلی کے لئے حکومت کا غیر جانب دار ہونا از حد ضروری ہے اور جب کوئی حکومت اس فرضِ منصبی سے چشم پوشی کرتے ہوئے جانب داری پر اتر آتی ہے تو جزوی طور پر وہ افراد پر مسلط (SUPERIMPOSE) ہو جاتی ہے حکومت کا یہ تسلط فرد کے انفرادی SPHERE کی نفی ہے چونکہ سرمایہ دار جمہوری ممالک میں قانون ساز بھی انسانوں ہی کی خو میں ہے اور وہ ادارے جن سے حکومت عبارت ہوتی ہے عوام کو جوابدہ ہوتے ہوئے بھی ایک مطلق العنان حیثیت رکھتے ہیں اور عاملانہ اختیارات کی بنا پر عوام کو بے وقوف بنانے اور ان پر اپنے فیصلوں کا اطلاق کرنے پر قادر ہوتے ہیں اس بنا پر افراد کے ساتھ جانب داری کی لعنت کا سدباب ممکن نہیں ہے، اسلام واحد نظامِ حیات ہے جو انفرادی SPHERE کو تحفظ کی مکمل ضمانت دیتا ہے اور قومی یا اجتماعی ... SPHERE میں کسی قسم کی جانب داری کو روا نہیں رکھتا، وہاں کسی قسم کے SUPERIMPOSITION کی گنجائش اس لئے نہیں ہے کہ عاملانہ اختیارات کے حامل ادارے مطلق العنان نہیں ہوتے، نہ من مانے قوانین بنائے جا سکتے ہیں اور نہ فیصلے صادر کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اسلامی نظم میں صرف خدا ہی LAWGIVER ہے اور اس کا قانون اٹل ہے۔ نہ اس

میں مصلحتوں کے پیش نظر تبدیلی کی گنجائش ہے اور نہ کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے ترمیم کی اجازت، تمام افراد اپنی مختلف حیثیتوں کے باوجود خدا کے آگے برابر کے ذمہ دار اور جوابدہ ہیں، چونکہ فرد کو اپنے انفرادی SPHERE کا مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے اور قومی یا اجتماعی SPHERE میں کسی بے عنوانی سے متعلق باز پرس کا اسے پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے اس بنا پر فرد خلوصِ دل اور تندہی سے قومی مفادات، مقاصد اور اقدار کے لئے خود کو وقف کر دیتا ہے دوسری جانب قومی SPHERE میں کسی بے عنوانی کے امکانات کا ازالہ اس لئے ہو جاتا ہے کہ فرد باز پرس کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے خدا کے آگے جوابدہی مستزاد ہے اس طرح اسلامی نظام انفرادی اور قومی SPHERE میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرتا ہے، جو نہ اشتراکیت کو نصیب ہو سکی، نہ سرمایہ دارانہ نظام کو۔ اور نہ جدید جمہوریت کو، اس طرح فرد کو اپنی شخصیت کے فطری تقاضوں کے پیش نظر بھرپور اظہار کا موقع ملتا ہے یہی اتحاد قومی SPHERE کی تعمیر و تزئین کا باعث ہوتا ہے یہ اسلامی نظام کی کامیابی کا راز ہے۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے اور لغو ہے کہ اسلامی نظام اپنے نفاذ کے قلیل عرصے کے بعد ہی ناکام ہو گیا وہ اسلامی نظام کی ناکامی نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کی بے راہ روی تھی جس نے اسلامی نظام کو بالائے طاق رکھ کر بادشاہت کو جنم دیا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح اشتراکی انقلاب اور اشتراکی نظام کے مقاصد اور تقاضوں کو نظر انداز کر کے روس میں اسٹالن نے انقلاب کے چند سال بعد ہی ایک شخصی اور آمرانہ حکومت قائم کی تھی

جس کو روس میں اسی کے جانشینوں نے بدترین حکومت قرار دیا ہے اور آج بھی روس کے اشتراکی نظام کے سربراہوں سے چین کے اشتراکی نظام کے سربراہوں کو اختلاف ہے چین سویت روس کو ایک اشتراکی ملک تسلیم کرنے کی بجائے سامراجیوں کا ایجنٹ قرار دیتا ہے، ہمیں نہ بھولنا چاہیئے کہ امیر معاویہ کی بادشاہت نہ اسلامی نظام کی ناکامی کا نتیجہ تھی اور نہ مسلمانوں کی سلطنت کے اندرونی نظام کو درست کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی، یہ بادشاہت ایک تحریک نہیں تھی جو اسلامی نظام کی خامیوں کو دور کرنے وجود میں آئی تھی بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ امیر معاویہ مفاد پرست جاہ پسند اور اقتدار کے بھوکے تھے اور حضرت عمر فاروق رضؓ کے دور ہی سے جب کہ اسلامی نظام کا دور عروج تھا۔ وہ اسلامی نظام کو تباہ کر کے اقتدار حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ عرب میں بادشاہت کے ظہور کی نوعیت خارجی حملے کی سی تھی، داخلی خلفشار یا دور کے مروجہ اسلامی نظام کی خامیوں کا اس میں دخل نہ تھا، جب کہ دنیا میں اشتراکی نظام کا تجربہ داخلی یعنی اس نظام کی اساسی خامیوں کی بنا پر ناکام ہو رہا ہے اسٹالن ہی کے دور حکومت سے روس کا اشتراکی نظام اپنے اساسی اصولوں کی IMPRACTICABILITY کی بنا پر بنیادی طور تبدیلیوں کا شکار رہا، یہی تبدیلیاں روس اور چین کی اشتراکی حکومتوں میں اس قدر شدید اختلاف کا باعث ہیں کہ ان میں آپس میں ٹھن گئی ہے لیکن چین میں بھی ایسی ہی اساسی تبدیلیوں کے امکانات واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

ویسے روس یا چین پر ہمارے ان کرم فرماؤں نے واہ واہ کے ڈونگرے برسائے ہیں جن کو ان ممالک کی سیاحت کا موقع ملا ہے کسی ملک کا دورہ کر کے وہاں کی مادی ترقی کا اجمالی جائزہ تو لیا جا سکتا ہے، لیکن چند دنوں میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہوئے خواہ کوئی کتنا ہی ذہین، نکتہ رس اور دقیق نظر ہو، وہاں کے داخلی نظام کی خامیوں اور وہاں کے عوام کی زندگی کا حقیقی رنگ نہیں دیکھ سکتا، لیکن کیا کہا جائے کہ ادھر ہمارے ان کرم فرماؤں نے چین کی زمین پر قدم رکھا اور ایک پرجوش استقبال کے ساتھ ہی انہیں چین میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیرے کی طرح واضح نظر آنے لگتی ہیں۔ اور وہاں سے واپس آتے ہی قصیدہ خوانی شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے ان کرم فرماؤں نے عوام الناس کے قابل لحاظ حد تک بڑے طبقے کو گمراہ کیا ہے، پاکستان کے دورے پر بھی بہت لوگ آ جا چکے ہیں، ان کی بڑی ضیافتیں ہوئیں خلوص اور محبت کے بے پناہ مظاہرے ہوتے رہے اور آئے دن ہم اخبارات میں دیکھتے رہے کہ آنے جانے والے ایوب خاں اور ان کی حکومت کی تعریف کے پل باندھتے رہے، لیکن کیا واقعی وہ دور ہماری قومی تاریخ کا قابلِ تعریف دور رہا۔ جب کہ عوام اپنے بنیادی حقوق سے تک محروم تھے کیا واقعی پاکستان کی عوامی زندگی قابلِ تعریف رہی ہے۔ تعریفوں کے پل ہمیں کس قدر مضحکہ خیز لگتے تھے اور یہ بیانات کتنے بے معنی اور خلاف حقیقت ہوتے تھے چین یا روس میں چند روز گھوم پھر کر چند سیاسی رہنماؤں کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر اور شاندار ڈنر کھا کر لوٹ آنے

والے پاکستانیوں کی داستانوں پر ہم کیونکر اعتماد کر سکتے ہیں، چین اور روس تو دنیا کے وسیع و عریض ملک ہیں چند دن تو کراچی کے ایک محلے اور محلے والوں کے مسائل کی نوعیت سے واقفیت کے لئے ناکافی ہیں بلکہ اسی شہر میں ایک محلے کے رہنے والے برابر کے محلہ والوں کے مسائل سے بے بہرہ ہیں، حالانکہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے برسوں گذر چکے ہیں یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہر ملک غیر ملکی مہمانوں کو وہی کچھ دکھلاتا ہے جو قابل دید ہوتا ہے اور جس کا پراپگنڈہ مقصود ہوتا ہے پھر اشتراکی ممالک کو قدیم ہندوستانی پردے سے بھی کہیں زیادہ سخت آہنی پردے میں اپنے عوام کو چھپائے رکھتے ہیں پردہ داری کے اس قدر حامی ممالک سے یہ توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ وہ غیر ملکی مہمانوں کو آزادی کے ساتھ ان کی قومی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لینے کی اجازت دیں گے۔ روس کے متعلق تو اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ وہاں کی عوامی زندگی کے خد و خال بے حد واضح ہو چکے ہیں چین کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنے کی بجائے صرف دو اقتباسات ہی درج کئے جاتے ہیں جس سے وہاں کی زندگی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

"عوامی حکومت نے عوام الناس کو اس حد تک شکنجے میں جکڑ رکھا ہے کہ خوف ہی وقت کا نمایاں ترین جذبہ محسوس ہوتا ہے مخبر تمام کے ڈر سے کوئی عوام میں لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا، لوگ ہنستے حتیٰ کہ

مسکراتے ہوئے تک ڈرتے ہیں کہ کہیں مخبر نہ ہو جائے
اور تحقیقات کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے کوئی شخص
دوسرے اشخاص سے خود کو منسوب کرنے کی جرأت
نہیں کرتا کہ اس انتساب کی بنا پر کہیں کوئی الزام سر
نہ آجائے اور تعذیب کا باعث نہ ہو، حقیقت تو یہ ہے
کہ کوئی آزادانہ طور پر سوچنے تک کی جرأت نہیں کر سکتا
کہ کہیں ان خیالات کو سازش نہ لیا جائے اور حکومت
کے کانوں میں بھنک نہ پڑ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ "عوامی
حکومت" کے تحت عوام سرد، خاموش اور بے مہر ہو کر
رہ گئے ہیں۔ یہ وہ عوام ہیں جو ہنسنا تک بھول گئے ہیں"۔

(خونی پروگریس اِن ریڈ چائنا از البرٹ اُدمار)

مذکورہ بیان پر رنگ آمیزی کا گمان گزرتا ہے۔ لیکن عوامی چین کے متعلق
ایسے بیانات عام ہیں۔ ۱۹۵۲ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ انقلاب کو ابھی
تین ہی سال گذرے تھے غیر ملکی سیاحوں کی نقل و حرکت پہ شدید پابندیاں
ابھی عائد نہیں کی گئی تھیں۔ جب ہندوستان کے راجہ ہٹی سنگھ نے
چین کا دورہ کیا، راجہ ہٹی سنگھ ایک معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے
یہ دورہ ان دنوں کیا تھا جب "ہندی چینی بھائی بھائی" تھے۔ ہٹی سنگھ
شنگھائی کے ایک پرائمری اسکول کے متعلق لکھتے ہیں:

"جماعت میں بچوں کو باہمی محبتوں کا درس دیا جا رہا

تھا، وطن سے نفرت، عوام سے محبت، محنت سے محبت، سائنس سے محبت اور عوامی جائداد کی حفاظت
والدین یا خاندان سے محبت کا سرے سے تذکرہ ہی نہ تھا، اور یہ چھوٹے بچے اس محبت سے محروم تھے وہ مہمانوں (VISITORS) سے چمٹے جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان سے محبت جتائی جائے اور اُن کو چوما جائے مجھ، بچوں کو اٹھا کر تھپتھپایا گیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ظلم کیا چیز ہے، اور مقامات پر بھی اُن بچوں میں جو ہمیں دیکھ کر ہمارے اطراف جمع ہو جاتے تھے، عورتوں اور مردوں میں جن کی آنکھیں ذرا سی محبت کی متلاشی تھیں، میں نے اس ظلم کی پرچھائیاں دیکھیں، نئے چین سے وہ چہرے ناپید ہو چکے جو دوستی کا تاثر رکھتے تھے جو لوگ چین میں برسوں سے رہتے ہیں اہل چین کی اخلاص کے باوجود مسکراہٹوں کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں، لیکن آج وہی چہرے سخت اور خاموش ہیں۔

(دی گریٹ بیس از راجہ ہٹی سنگھ)

چین ہی نہیں سارے اشتراکی ملک کا یہی حال ہے اشتراکی حکومتوں نے مخبری کا پیچ در پیچ سلسلہ جاری کر کے عوام الناس۔ فرد۔ کو اپنی

شخصیت ہی کے اظہار سے محروم کر دیا ہے ہم نے انگریز قوم کی اس پالیسی پر ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا ہے کہ عوام الناس میں اس نے نفرت پھیلا کر اپنا الو سیدھا کیا، "لڑاؤ اور حکومت کرو" اس قوم کا نصب العین رہا ہے، لیکن انگریز ہی دُنیا کی واحد قوم نہیں ہے جو اس پالیسی پر کاربند رہی ہے اشتراکی ممالک میں "پرولتاری" حکومتیں بھی اپنی آمرانہ حیثیتوں کو برقرار رکھنے کی غرض سے ایسی ہی پالیسی پر کابند نظر آتی ہیں بلکہ انگریزوں سے بھی کچھ آگے ہی رہی ہیں انگریز قوم نے یہ نفرت انگیز پالیسی نو آبادیات کے لئے وضع کی لیکن اشتراکی حکومتوں نے اپنے ہی عوام کو اس لاٹھی سے ہانکا ہے، انگریز نے اگر منافرت کے بیج بوئے اور ساری دُنیا کے سنجیدہ عناصر کی ناپسندیدگی مول لی تو اشتراکی حکومتوں نے بڑے سلیقے سے عوام کے شیرازے کو منتشر کر دیا۔ تاڑنے والے تاڑ گئے لیکن پسماندہ ممالک کے عوام نے جو اشتراکی نظام کو اپنی فلاح کا ضامن سمجھ بیٹھے ہیں ابھی تک سمجھا نہیں ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت مرکزی حکومت بڑی ہی خوش اسلوبی سے عوام کی شیرازہ بندی کے بجائے عوام کو منتشر رکھنے پر زور دیتی ہے، ایک تو منجمد کی کے پیچ در پیچ سلسلے کے ذریعہ اور دوسرے قومیت اور علاقہ داریت کو فروغ دے کر عوامی حلقوں میں جذباتی خلیجیں حائل کر کے۔

اشتراکی طرزِ حکومت اور عوام

اشتراکی ممالک کو مخبری کے اس قدر ہمہ گیر نظام کی ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ وہاں کے نظامِ حکومت، دوسرے اداروں اور ان کی تمام کارروائیوں کو عوام کا پورا پورا اعتماد اور مکمل تائید حاصل ہے، اگر اشتراکی رہنما عوام کے ہیرو ہیں، اگر ان کی حکومت عوام کی پسندیدہ حکومت ہے اور اشتراکی نظام کو وہ اپنی فلاح و بہبود کی ضمانت جانتے ہیں تو پھر اشتراکی قیادت، اشتراکی حکومت اور اشتراکی نظام کو کاہے کا خوف ہے کہ ان کے اطراف مخبری کا اس قدر مضبوط جال بنا ہوا ہے، عوام پر اس قدر کڑی نگرانی کی غرض دغایت کیا ہے کہ گلی گلی کوچہ کوچہ جاسوسی تنظیموں کے ہرکارے پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ہر شہری پر یہ فرض کیوں عائد کیا گیا کہ وہ ہر ایسی بات کو حکام تک فوراً پہنچا دے جو مروجہ نظام کے تحت قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے کہ اس فرض کی تکمیل سے غفلت کو موجبِ سزا قرار دے دیا گیا ہے حد یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے، بھائی اپنے ہی بھائی سے اور باپ اپنے ہی بچوں سے اشتراکی نظام یا حکومت کی کسی کارروائی سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ڈرتا ہے افراد کو غیر انسانی اور ظالمانہ سزاؤں کے ذریعہ ڈرا ڈرا کر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے بستے، اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اس قدر دور اور اس دوسرے کے لئے اس قدر اجنبی کیوں کر دیا گیا ہے جوزف ڈیویز نے جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک اشتراکی روس میں امریکہ

کے سفیر رہے ہیں اپنی حکومت کو روس کے حالات پر ایک خفیہ رپورٹ ارسال کرتے ہوئے یکم اپریل ۱۹۳۸ء کو لکھا:

"خوف و دہشت یہاں (روس) پر ایک لرزا دینے والی حقیقت ہے ماسکو ہی میں اس کی کئی شہادتیں فراہم ہیں کہ یہ دہشت قوم کے تمام حلقوں کو لپیٹ میں لئے ہوئے ہے، کوئی گھرانہ خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو نمایاں طور پر خفیہ پولیس کے شبینہ چھاپے کے خوف میں مبتلا نظر آتا ہے یہ چھاپے عموماً رات کے پچھلے پہر ایک اور تین بجے کے درمیان پڑتے ہیں ایک بار کوئی شخص لے جایا جائے تو مہینوں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوتا، اور کئی بار تو کبھی کچھ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کا کیا بنا، متعدد ذرائع سے اس قسم کے حالات کی شہادتیں فراہم ہوتی ہیں، یعنی ان بیانات کے ذریعہ جو عینی شاہدوں نے ایسے واقعات سے متعلق مجھے یا میرے اسٹاف کو دیئے ان بیانات کے ذریعہ جو میرے اسٹاف کے افراد کے عینی مشاہدے پر مبنی تھے (مثلاً ایک بار رات کے ساڑھے تین بجے برابر والے مکان کے سامنے ایک بدنصیب شخص کو گرفتار کر کے ظالمانہ انداز میں اس کے گیارہ سالہ بچے سے جدا کر دیا گیا) روسی شہریوں کے ان بیانات کے ذریعہ

جو کسی نہ کسی وجہ سے مدد کے طالب ہو کر ہمارے سفارت خانے میں چلے آتے ہیں، اس صورتِ حال کے تحت عوام کا نفسیاتی ردِ عمل اور اس دہشت کی شدت اس حقیقت سے بھی آشکارا ہوتی ہے کہ تقریباً روزانہ ہی باورچی خانوں اور ملازمین کے کوارٹروں سے سرگوشیوں میں پرخوف رازداری کے ساتھ جاننے پہچاننے والوں کی تازہ گرفتاریوں، نئی اذیتوں، نئے اندیشوں، اور نئی پریشانیوں کی اطلاعات ملتی ہیں ...... بعض اعلیٰ ترین حکام سے اس موضوع پر ان کے خیالات خود انہیں کی زبانی سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ظلم و ستم پارٹی کے لیڈروں کی جانب سے عمداً روا رکھا جا رہا ہے جنہیں خود بھی اس ظلم و ستم کی ضرورت پر افسوس ہے لیکن اپنے فرض کی تکمیل میں وہ نہ جذباتی ہونا چاہتے ہیں اور نہ کمزور پڑنا چاہتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ گلاب پاشی سے ایک عظیم انقلاب تکمیل نہیں پا سکتا اور پرولتاری مفادات کی حامی تحریکیں ماضی میں غلط جذبات یا کمزوری کی بنا پر تباہ کر دی گئیں، وہ مانتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ اس طرح بہت سے بے گناہ بھی پھنس جاتے ہیں لیکن یہ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے

جارفع واعلیٰ ہے"۔

(مشن ٹو ماسکو از جوزف ڈیویز ۱۹۴۴ء)

یہ کسی پراپگنڈہ باز کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ ایک سفیر کی رپورٹ کا اقتباس ہے جو اس نے اپنی حکومت کو اسٹالن کے دورِ حکومت میں عوام پر ظلم وستم کے متعلق خفیہ طور پر پیش کی تھی، جس کی تصدیق اسٹالن کے ایک جانشین نکیتا خروشچوف نے روس کی کمیونسٹ پارٹی کے فرسٹ سکریٹری کی حیثیت سے ماسکو میں ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۵۶ء کو منعقد کمیونسٹ پارٹی کے بیسویں اجتماع کے ایک خفیہ اجلاس میں کی تھی۔ اس تقریر کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:

"ایک شخص (اسٹالن) کے خودسر اور خودپسندانہ طرز نے دوسروں میں خودسری اور خودپسندی کو ابھارا اور روا رکھا، وسیع پیمانے پر گرفتاریاں، کئی ہزار افراد کا انخلا، ضروری تحقیقات اور مقدمہ کی کارروائی کے بغیر موت کی سزائیں۔ ان کارروائیوں نے عدم تحفظ دہشت حتیٰ کہ مایوسی سے عبارت حالات کو جنم دیا اس سے نہ مزدوروں کی فلاح و بہبود کا سامان ہوا اور نہ پارٹی کی صفیں ہی مضبوط ہوسکیں، اس کے برعکس ان کارروائیوں سے پارٹی سے ان کارکنوں کا اخراج اور قلع قمع ہوا جو پارٹی کے وفادار تھے لیکن اسٹالن

سے ان کے ستارے نہیں ملتے تھے۔"

"اسٹالن نے شدید طریقوں سے وسیع پیمانے پر اس وقت جبر و استبداد کو روا رکھا جب کہ انقلاب کامیاب ہو چکا تھا، سوویت یونین مستحکم ہو چکی تھی؛ استحصال کرنے والے طبقات کا قلع قمع ہو چکا تھا، قومی معیشت کا ہر پہلو سوشلسٹ طرز پر تعمیر ہو چکا تھا اور ہماری پارٹی سیاسی طور پر منظم تھی۔"

"اب جبکہ مرکزی کمیٹی کے بعض اراکین اور امیدواروں کے کیس جانچے گئے جنہیں غدار اور جاسوس قرار دیا گیا تھا تو معلوم ہوا کہ یہ سارے کیس فرضی تھے، دشمن سرگرمیوں کے الزام کے تحت بہت سے گرفتار شدگان سے ظالمانہ اور غیر انسانی اذیتوں کے ذریعہ اقبالی بیانات حاصل کئے گئے"

"کئی ہزار دیانت دار اور بے گناہ کمیونسٹ اس قسم کے جھوٹے الزامات کے تحت ہلاک کر دیئے گئے۔"

"اس نوع کے اکثر کیس دوبارہ جانچے گئے ان میں سے اکثر کو کالعدم کیا جا رہا ہے کہ یہ بے بنیاد اور جھوٹے ہیں، اتنا کہنا کافی ہے کہ ۱۹۵۴ء سے آج تک (۷۶۷۹) اشخاص کو سپریم کورٹ کے ملٹری کالیجیم نے بحال کر دیا ہے۔"

"ساتھیو! ایک فرد کی روش نے جماعتی کارروائیوں

اور معاشی سرگرمیوں میں غلط اصولوں کو رواج دیا،
اس نے اندرونی جماعت بندی اور سوویت جمہوریت کی
تحریف کی ہر قسم کی کج روی کی حوصلہ افزائی کی، جامد
انتظامیہ کو جنم دیا حامیوں کی پردہ پوشی کی اور حقیقت
کو ناپید کر دیا۔ ہماری قوم نے چاپلوسوں، خیالی پلاؤ
پکانے والوں اور دھوکہ اور فریب کے ماہرین کو جنم
دیا ہے۔"

(نیویارک ٹائمز ویکلی ریویو، ۱۰ر جون ۱۹۵۶ء)

چین کے متعلق البرٹ اڈیارا اور راجہ منی سنگھ کی تحریروں کے
اقتباسات اور روس کے متعلق جوزف ڈیویز کی رپورٹ اور
خروشچوف کی مذکورہ تقریر کی صداقت اس لئے مشکوک نہیں ہے
کہ سوشیلسٹوں کے امام۔ لینن۔ کی تحریروں اور تقریروں کے مجموعہ
سے جسے ماسکو کے پروگریس پبلشرس نے شائع کیا ہے، اس قسم کی
دہشت انگیز اور ظالمانہ کارروائیوں کی تائید ہوتی ہے۔

"یقیناً" (ایک موقع پر) مصلحت کے پیش نظر ہم نے انفرادی بنیاد
پر دہشت گردی کو روا نہیں رکھا تھا لیکن PLEKHANOV
نے بھی سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۳ء کے درمیانی عرصے میں جبکہ
وہ مارکسی نظریات کا حامی اور انقلابی تھا (دراب
نہیں رہا) ان لوگوں کا مضحکہ اڑایا ہے جو عظیم فرانسیسی

انقلاب کی دہشت گردی یا کسی فتح مند انقلابی جماعت (روس کی کمیونسٹ پارٹی کی جانب اشارہ ہے) کی جانب سے (حصول مقصد کے لئے) عام طور پر بروئے کار لائی ہوئی دہشت گردی کو رد کرتے ہیں"۔

(سیلیکٹڈ ورکس از لینن ماسکو ص ۵۲۶)

لینن نے PLEKHANOV کے حوالے سے دہشت گردی کی حمایت کرتے ہوئے یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ ان لوگوں کا ذکر ہی کیا جو مارکسی نظریات کے سختی سے حامی اور پکے "انقلابی تھے" PLEKHANOV جیسے "پکے" مارکسی اور انقلابی تک دہشت گردی کے حامی رہے ہیں "امریکی مزدوروں کے نام مکتوب" میں لینن نے مغربی یورپ کے جمہوری ممالک کے اس نقطۂ نظر کا مضحکہ اڑایا ہے کہ روس کی کمیونسٹ تنظیم نے دہشت گردی کے ذریعہ "انقلاب" کو کامیاب بنایا ہے:

"ان (بورژوائیوں) کے نقیب ہمیں دہشت گردی کو بروئے کار لانے کا الزام دیتے ہیں... برطانیہ کے بورژوائی ۱۶۴۹ء کو بھلا بیٹھے ہیں اور فرانسیسی بورژواؤں نے ۱۷۹۳ء کو فراموش کر دیا ہے (جب ان کے ممالک میں بورژوا انقلاب برپا ہوئے تھے) جاگیردارانہ نظام کے خلاف اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے بورژواؤں کی جانب سے بروئے کار لائی ہوئی دہشت گردی ترحق

بجانب اور قانونی طور پر جائز تھی، لیکن جب مزدوروں اور غریب کسانوں نے (روس میں) بورژوائوں کے خلاف اسی آلۂ کار (دہشت گردی) کو اپنانے کی جرأت کی تو یہ ظالمانہ اور جابرانہ اقدام ہو گیا! جب استحصال کرنے والے ایک اقلیتی طبقہ نے اپنی بجائے دوسرے استحصال کرنے والے اقلیتی طبقے کو بحال کرنے کے لئے دہشت گردی کو اپنایا تو یہ جائز اور حق بجانب تھا اور جب دہشت گردی کو استحصال کرنے والے اقلیتی طبقے کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا گیا، جب دہشت گردی کو حقیقی معنوں میں کثیر اکثریت کے مفادات کے تحفظ کے لئے استعمال کیا گیا اور جب دہشت گردی کو پرولتاری اور نیم پرولتاری طبقات، غریب کسانوں اور مزدور طبقے کے مفادات کے لئے استعمال کیا گیا تو یہی دہشت گردی انتہائی ظالمانہ اور مجرمانہ فعل قرار پائی!"

(سیلیکٹڈ ورکس از لینن ماسکو صفحہ ۶۳)

یہاں لینن نے کسانوں اور مزدور طبقے کے مفادات کے تحفظ کی غرض سے اور استحصال کرنے والے طبقات کا قلع قمع کرنے کے لئے دہشت گردی کو حق بجانب اور جائز قرار دیا ہے۔ ایک اور موقع پر لینن نے لکھا ہے:

"خوف و دہشت کو اصولاً نہ ہم نے کبھی رد کیا ہے اور نہ ہم
ہم کبھی رد کر سکتے ہیں۔"

(سیلیکٹڈ ورکس از لینن ماسکو صفحہ ۳۸)

یہ تو لینن کے ارشادات ہیں اسٹالن نے فرانسیسی مزدوروں کے ایک وفد کو ۵ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا.

"نہیں کامریڈز! ہم نہیں چاہتے کہ ہم پیرس کے کمیونارڈز
کی غلطیوں کو یہاں دہرائیں G.P.U. روس میں
دہشت انگیز کارروائیوں کا ایک ذمہ دار ادارہ ہے
انقلاب کے لئے ضروری ہے اور یہ ادارہ قائم رہے گا
اور پرولتاری کے دشمنوں کو دہشت زدہ کرتا رہے گا۔"

(لیننزم جلد اول ص ۴۱۹)

اشتراکی ممالک میں یہ دہشت انگیز اور ظالمانہ کارروائیاں کس کے خلاف برسہا برس تک روا رکھی گئیں اور اب بھی ان کا سلسلہ جاری ہے؟ پرولتاریہ کے دشمنوں کے خلاف یا ان انسانوں کے خلاف جنہوں نے ایک غیر عوامی اور آمرانہ مرکزی حکومت کے تحت جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی، ایک محتاط اندازے کے مطابق روس کا شاید ہی کوئی خاندان ہو جس کا ایک بھی فرد ان تقطیری کارروائیوں کی زد میں آیا ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کارروائیوں کا مقصد فرد کے اپنی شخصیت کے آزادانہ اظہار کے مطالبے اور خواہش کو کچلنا تھا جو ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر آمرانہ حکومت نے فرد کو مفلوج کرنے کی کوشش کی، آزادیاں سلب کر کے ظالمانہ کارروائیوں کے ذریعہ افراد پر اس قدر دہشت طاری کردی

گئی کہ لب کشائی کا حوصلہ جاتا رہا۔ اشتراکی نظام نے عوامی اور عوام کی پسندیدہ اور عوام کی بھلائی کی بہترین ضامن تحریک ہوتے ہوئے یہ انداز کیوں اختیار کیا؟ امریکی سفیر جوزف ڈیویز نے عہدہ سفارت سے سبکدوش ہوتے ہوئے ماسکو میں اپنے عملے کو مخاطب کرتے ہوئے الوداعی تقریر میں کہا:

"غور کیجئے بہت سے یورپی ممالک، (خصوصاً روس) کے مقابلے ہمیں (امریکی عوام) کو کیا نعمتیں حاصل ہیں، ہمیں آزادی حاصل ہے شخصی آزادی، ہمیں تقریر کی آزادی حاصل ہے، ہمیں پر امن احتجاج کی آزادی حاصل ہے، ہمیں آزادیٔ فکر حاصل ہے، ہمیں اپنے ضمیر کے تقاضوں کے مطابق خدا کی عبادت کا حق حاصل ہے، ہماری آزادی ہماری زندگی، ہماری جائداد اور ہمارے حقوق کا تحفظ خود ہماری حکومت کے مقابلے پر تک ممکن ہے ہر شخص اپنی دنیا کا بادشاہ ہے ہماری زندگی اور ہماری آزادیوں کا تحفظ ایسے قوانین کے ذریعہ کیا گیا ہے کہ ایک مکمل طور پر بااختیار حکومت کو بھی کسی شخص کو سزا دینے سے پہلے اس جرم کو معقول حد تک ثابت کرنا پڑتا ہے ..... مردانگی اور نسوانیت کا وقار، انسانی زندگی اور آزادی کا تقدس، انسان کی عزتِ نفس، دنیا میں

تہذیب کا بہترین انعام ہیں .... میں ان مادی یا
سماجی فائدوں کی پرواہ نہیں کرتا جو مطلق العنان یا
آمرانہ حکومتوں نے بوڑھوں یا بچوں کو بہم پہنچائے ہیں
ان کے لئے اگر آزادی یا خود مختاری کو قربان کرنا ہو تو
پھر یہ قیمت ادا نہیں کی جا سکتی"

(مشن ٹو ماسکو از جوزف ای ڈیویز)

اشتراکی ممالک میں چونکہ عوام کو سبز باغ دکھلا کر ان پر ایک ADEALOGY کو مسلط کرنا مقصود رہا ہے اور چونکہ حقائق کی آندھیاں سبز باغوں کو اجاڑ کر رکھ دیتی ہیں اور چونکہ عوام کی اجتماعی طاقت ناقابل شکست ہوتی ہے اس لئے اشتراکی نظام کے علمبردار اقتدار حاصل کرتے ہی پہلی فرصت میں دہشت انگیز کارروائیوں کے ذریعہ عوام کو مجتمع ہو کر ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے ابھرنے کی راہیں مسدود کرتے ہیں، بنیادی آزادیاں خصوصاً آزادی فکر، آزادی تقریر، آزادی تحریر اور آزادی اجتماع کو سلب کر کے اور ان آزادیوں کی حمایت میں اٹھنے والی متوقع تحریکوں کو ایک طرف ظالمانہ اور سفاکانہ انداز میں کچل کر تو دوسری طرف اس ظلم و سفاکی سے عوام کو دہشت زدہ کر کے عوام کی اجتماعی طاقت کو منتشر رکھا جاتا رہا ہے، حالانکہ اشتراکیت ہی اجتماعیت کی سب سے بڑی علمبردار تحریک ہے جس کے تحت فرد سماج کے دوسرے افراد تو کجا

اپنے ہی گھر اور خاندان میں تنہا اور اجنبی ہو کر رہ گیا ہے' ...

DIVIDE & RULE کی طرح SPLITUP & RULE

اشتراکی نظام کا مسلک ہے جس نے فرد کو اس قدر دہشت زدہ اور مفلوج کر کے رکھ دیا کہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرنے کی جرات وہ کسی وقت، کسی موقع پر کر ہی نہیں سکتا وہ اپنے گھر والوں سے تک ڈرتا ہے، جیسے کہ آہنی انسان ماؤ زے تنگ نے چین کی کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے پارٹی اسکول کا افتتاح کرتے ہوئے یکم فروری ۱۹۴۲ء کو کہا۔

"... ہمیں نفاق کے ہر اظہار کا خاتمہ کرنا چاہیئے ہمیں کامریڈوں کی ہمت افزائی کرنا چاہیئے کہ وہ کل کو پیش نظر رکھیں، پارٹی کے ہر رکن کو، کام کے ہر شعبے کو، ہر بیان اور ہر فعل کو کل پارٹی کے مفادات ہی کے تحت ہونا چاہیئے اس اصول کی خلاف ورزی قطعی طور پر ممنوع ہے ....

ہمیں ایک متحد اور مرکوز پارٹی کی تعمیر کرنی چاہیئے اور غیر اصولی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کا صاف ستھرا قلع قمع کر دینا چاہیئے کل پارٹی کے قدم ملا کر آگے بڑھنے اور ایک مشترک مقصد کے لئے جد وجہد کرنے کے لئے ہمیں انفرادیت پسندی اور فرقہ پرستی سے نمٹنا چاہیئے۔"

(ریکٹیفائی دی پارٹیز اسٹائل آف ورک از ماؤزے تنگ ۱۹۶۵ء فارن لینگویج پریس پیکنگ)

اشتراکی نظام نے جہاں بنیادی حقوق اور آزادیاں سلب کر کے فرد کو مفلوج اور دہشت انگیز کارروائیوں کے ذریعہ افراد سے حوصلہ چھین لیا۔ ہاں ملکی اور عوامی سطح پر بھی اسی قسم کی کارروائیاں جاری رکھی گئیں کہ عوام کا شیرازہ منتشر ہی رہے اور عوامی کی اجتماعی طاقت کسی نکتہ پر ہرگز نہ ہو سکے۔ بلغاریہ (روس کا زیرِ نگین ملک) میں انفرادیت کو کچلنے کی کوشش اس طرح کی گئی۔

"حکومت نے اوقاتِ فرصت سے بھی لطف اندوز ہونے پر پابندی لگادی ہے، ایک شخص کا ذریعہ معاش چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اسے اپنی چھٹیاں اور ہفتے کا آخری دن ہاتھ کی محنت کر کے گذارنے پر مجبور کر دیا گیا۔۔۔
پھر جماعتی تنظیم کے بہت سے ایسے کام ہیں جو ایک شہری کو اپنے اوقاتِ فرصت میں "رضاکارانہ" طور پر انجام دینے ہوتے ہیں، ہفتہ میں ایک بار ان شبینہ لکچروں میں حاضر ہونا پڑتا ہے جو مارکسیزم کے نظریہ اور پانچ سالہ منصوبے پر دیئے جاتے ہیں اگر کوئی شخص اخبار پڑھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے وہی اخبار آجاتے ہیں جو حکومت کی نگرانی میں پریس شائع کرتا ہے کسی اخبار کو حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے کی جرارت نہیں وہ تمام اخبار جو عوام کی تکلیفوں پر کچھ لکھا کرتے تھے یا جن کی پالیسی

غیر اشتراکی تھی یا جو کسی خاص فرقے کی نمائندگی کرتے تھے مت
ہوئی بند کر دیئے گئے ہیں ... اگر کوئی شخص کسی محفل سرود
میں جانا چاہے تو وہاں بھی اسے وہی پروگرام سننے میں آئے گا
جو حکومت کی ہدایت کے مطابق بورڈ نے تیار کیا ہے اگر
کوئی بلغاری مصنف اپنی تصنف کو شائع کرانا چاہتا ہے
تو سب سے پہلے جانچ پڑتال کے لئے اسے اپنا سیاسی ریکارڈ
حکومت کے مشورہ بورڈ کے سامنا رکھنا ہوتا ہے اسی طرح
جو مصوّر اپنی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش کرنا چاہتا ہے
اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حکومت کی منظورہ تصاویر
پیش کرے۔

(کوثر لاہور ۸ر اپریل ۱۹۵۰ء)

اشتراکی نظام طبقہ واریت اور فرقہ واریت کا دشمن ہے اقتصادی اعتبار
سے عوام کی طبقاتی تقسیم اور مذہبی یا عقیدے کے اعتبار سے فرقہ وارانہ
تقسیم ہی کو استحصال کا سبب قرار دے کر اشتراکی نظام نے اسے
رد کر دیا روس اور چین کی اشتراکی قیادت متفقہ طور پر طبقہ واریت اور
فرقہ واریت کے خلاف صف آرا ہے لیکن اسکے باوجود عوام کئی اعتبار سے
تقسیم ہوتے ہیں مثلاً نسل کی بنیاد پر، زبان، علاقہ واریت اور روایات
کی بنیاد پر، یہ تقسیم غیر اہم سمجھی جاتی ہے اور قومیں جب بھی کسی عظیم مقصد کے
لئے جد وجہد کرتی ہیں ان تفرقات کو اس طرح بھلا دیا جاتا ہے جیسے ان

کا وجود ہی نہ ہو، ۱۷۷۶ء میں امریکی عوام برطانیہ کے خلاف حصول آزادی کے لئے اپنے تفرقات سے بلند ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ۱۹۳۹ء میں برطانیہ کے عوام نازی خطرے خلاف اپنے باہمی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر صف آرا ہوئے تھے ۱۹۶۵ء میں ہندوستانی حملہ آوروں کے خلاف پاکستان کے عوام اپنے تفرقات سے بلند ہو کر فرد واحد کی طرح متحد ہو گئے تھے، عوام کے ایسے ہی متحدہ اقدام نے ایوب خاں کو حکومت سبکدوش ہونے پر مجبور کیا تھا. پاکستان کے حصول کے لئے مسلمان عمومی طور پر اپنے باہمی تفرقات کو فراموش کر بیٹھے تھے. ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے منصوبۂ آزادی ہند کو عملی صورت دینے کے لئے عوام سے انگریزوں کے خلاف اپنے مطالبات منوانے کے لئے فردِ واحد کی طرح متحد ہو جانے کی اپیل کی تھی، عوام کے آپس کے ان اختلافات یا امتیازات کو مخصوص حالات کے سوا کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا. لیکن روس میں حکومت نے ان امتیازات کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ ان کو پروان چڑھایا ہے روس کے مختلف نسلی گروہوں اور قومیتوں کے متعلق روسی اشتراکی نظام کے ترجمان مارس ہنڈس کی کتاب "مدر رشیا" کا ایک اقتباس گذر چکا ہے:

"روس میں قریب قریب سو مختلف قومیتیں آباد ہیں -
بلکہ زیادہ، اگر ان نسلی گروہوں کو بھی شامل کر لیا جائے
جو تقریباً گمنام ہیں اور دور دراز علاقوں خصوصاً

روسی ایشیا اور روسی یورپ کے شمال میں آباد ہیں
..... زبان، تاریخ اور ان قومیتوں کے تمام خالص
قومی پہلوؤں کا نہ صرف احترام کیا جاتا ہے بلکہ ماسکو
(اشتراکی حکومتِ روس) نے اُن کو بھرپور انداز
میں اُبھارا ہے ان میں سے کئی قومیتیں رسم الخط تک
نہیں رکھتی تھیں لیکن اب انہیں رسم الخط حاصل ہے.
یہ سوویت یونین کی کرم فرمائی ہے....... اپنی معیشت
اور سیاسی سرگرمیوں میں تمام قومیتیں ماسکو (مرکزی
حکومت) کے تابع ہیں اور کسی قسم کے انحراف یا تجاوز
کو بے رحمی سے دبا دیا جاتا ہے... چھوٹی جمہوریتوں
اور قومیتوں کے اسکولوں میں روسی زبان "پہلی
بدیسی زبان" کی حیثیت رکھتی ہے.... چونکہ روسی
اس وسیع وعریض ملک کی کثیر اکثریت کی زبان ہے اس بنا
پر اس زبان سے واقفیت کی افادیت کے پیش نظر مقامی
حکومتیں اور ماسکو (مرکزی حکومت) کی جانب سے
اس زبان کو سیکھنے پر زور دیا جاتا ہے".

(مدر رشیا از مارلیس ہنڈرس ص ۹۹ ص ۱۰۱)

پسماندہ گروہ، قومتیں یا قومیں زبان، کے علاوہ اپنی مذہبی، قومی یا علاقہ وارانہ روایات، طرزِ معاشرت وغیرہ کے باب میں بے حد جذباتی اور قدامت پسند واقع ہوتی ہیں کسی ایک نسلی گروہ یا قومیت کے افراد میں جو کسی مخصوص علاقہ میں آباد ہوں ان کی زبان، طرزِ معاشرت، نسلی اور مقامی روایات اور تہذیب، ایک جانب تو ان افراد کے باہمی اتحاد کے لئے ایک جذباتی بنیاد فراہم کرتی ہے تو دوسری جانب ان افراد کو کسی دوسرے گروہ یا قومیت کے افراد سے خلط ملط ہونے سے بڑے جذباتی انداز میں باز رکھتی ہے، سرسید احمد خاں کی تحریک کے آغاز سے قبل ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کے ہندو باشندوں سے خلط ملط ہونے کے باوجود اپنی اس جذباتیت کی بنا پر انگریزوں سے دور رہنے ہی کو اپنی دنیا اور آخرت کی بھلائی کا سبب جانتے تھے اس جذباتی نقطۂ نظر کی وجہ سے عام طور پر ان کی ذہنی پسماندگی تھی، وہ اس بنا پر انگریز سے نفرت نہیں کرتے تھے کہ انگریز نے حکومت سے انہیں محروم کر کے غلام بنا رکھا تھا بلکہ اس واقعہ کا خاطر خواہ شعور تک جاتا رہا تھا در اصل اپنی ذہنی پسماندگی کی بنا پر مسلمان خام خیالی کا شکار تھا لیکن جہاں یہ جذباتیت کسی بنا پر کار فرما نہیں رہی تھی وہاں مسلمانوں کا اندازِ فکر و عمل قطعی طور پر مختلف تھا مثلاً ان ہندو باشندوں کے ساتھ وہ خلط ملط ہو گئے جو جانوروں، پتھروں، دریاؤں اور روحوں کو پوجتے ہیں، آواگون کے قائل ہیں اور دوسری

قوم کے افراد تو کبھی خود آپس ہی میں بدترین تعصبات کا شکار رہیں۔
لیکن انگریزوں کو اہل کتاب مانتے ہوئے بھی وہ انگریزوں کو کافر سمجھتے اور ان سے دور بھاگتے رہے۔ ہندو معاشرت، ہندو تہذیب ہندو رسوم و رواج وغیرہ تو انہوں نے اپنائے لیکن انگریز کی معاشرت تہذیب اور رسوم و رواج کو اپنانا ان کے نزدیک کفر تھا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ انگریز اہل کتاب ہیں یا کافر یا ان کی تہذیب و معاشرت اپنانا کارِ ثواب ہے گناہ، ظاہر کرنا یہ مقصود ہے کہ ذہنی طور پر پسماندہ قومیت یا فرقے اپنی زبان، معاشرت، تہذیب، عقائد، لوک اقدار علاقہ وارانہ روایات، نسلی امتیازات وغیرہ سے بڑی وابستگی ان میں باہمی اختلافات کے باوجود ایک ایسا اتحاد اور یک جہتی پیدا کر دیتی ہے کہ جس کے خاتمے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں چونکہ ایسے افراد کی آبادی عام طور پر ایک ہی مقام پر مرکوز ہوتی ہے اس لئے یا تو انہیں ایک دوسرے سے خاطر خواہ فاصلوں پر منتشر کر دیا جائے جو آبادکاری کی دشواری کے پیش نظر عملاً بے حد دشوار اور خرچ طلب ہے، یا پھر تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ انہیں اپنی محدود اور پست سطح سے بلند کر کے انہیں لاشعوری طور پر باشعور شہری بنانے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ وہ قومی سطح پر سوچنے سمجھنے اور جذباتیت سے بلند ہو کر وسعتِ قلب و نظر کے ساتھ عمل کرنے کے قابل ہو جائیں جو اشتراکی نظام کے در پردہ اور حقیقی مقاصد کے منافی ہے۔ چنانچہ

روس کی اشتراکی حکومت روس کے پسماندہ عوام کو جو نسلی گروہوں اور فرقوں۔ قومیتوں۔ میں بٹے ہوئے تھے، جذباتیت کی پست سطح سے ابھار کر شعور کی رفعتوں سے ہم کنار کرنے کی بجائے انہیں اسی سطح پر ٹھونس رکھا ہے جہاں ان کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو مرکزی حکومت نے راست طور پر اپنے سے متعلق رکھا ہے تاکہ ان میں شعور پیدا نہ ہو سکے وہاں ان فرقوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے اور ہر فرقہ اور قومیت کے افراد کو اپنی دنیا میں مگن رکھنے کی غرض سے، مرکزی حکومت نے ان قومیتوں کے خالص قومی پہلوؤں کو بھرپور انداز میں ابھارا ہے حتیٰ کہ ان کی اپنی زبانوں تک کو روسی زبان پر ترجیح دی گئی اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ زبان قومی اتحاد و یک جہتی میں ۔۔ قوم کے مختلف طبقوں اور فرقوں کو متحد کرنے میں۔ بڑا ہی اہم اور کارگر رول ادا کرتی ہے، اپنے غیر انسانی اور غیر جمہوری مقصد . . . . **SPLIT UPAND RULE** کے حصول کی خاطر جہاں روس کے پسماندہ عوام کو پسماندگی کی بھول بھلیوں میں جذباتی کھلونے دے کر بہلا دیا گیا وہاں ذی شعور شہریوں کو جو روس کے ترقی یافتہ علاقوں کے باشندے تھے، اور اپنی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو قومی سطح پر سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے، روس کی مرکزی حکومت نے دہشت گردی کے ذریعہ تنہائی کے اندھیروں میں دھکیل دیا کہ وہاں راستہ ٹٹولنے کا حوصلہ تک ان میں نہ رہا روس ہی نہیں ہر ہر

اشتنزا کی ملکہ نے یہی کہا ہے جب کہ اسلامی تحریک نے جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ افریقہ اور خصوصاً یورپ کے نیم وحشی باشندوں کو فرض جان کر انسانیت کی شاہراہ پر لا کھڑا کیا کہ آج وہ دُنیا میں اپنی ایک حیثیت کے مالک ہیں جس کا اقرار اب یورپ کے فاضلین خود بھی دبی زبان سے کرنے لگے ہیں۔ لیکن خود مسلمان اپنے اس کارنامے کو بھولتے جا رہے ہیں جنگِ یرموک سے پہلے رومیوں نے مسلمانوں کے خلاف بے پناہ تیاری کی اور شہنشاہ روم ہرقل نے اپنے تمام وسائل کو سمیٹ کر مسلمانوں کو قطعی طور پر فیصلہ کن جنگ لڑ کر شکست دینے کا مصمم ارادہ کیا تو مسلمانوں نے رومی فوج کے اس سیلاب کو روکنے کی غرض سے اپنے مقبوضہ علاقوں سے فوجیں ہٹا کر یرموک میں جمع کر دیں، مسلمانوں نے حمص، دمشق اور دوسرے شہروں سے نکلتے وقت وہاں کے باشندوں کو جزیہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ اب وہ ان شہروں کی حفاظت نہیں کر سکتے، اور ایک سخت ترین مرحلہ انہیں درپیش تھا، لیکن جب یہ مسلمان جزیہ کی رقم لوٹاتے تھے تو ان شہروں کے غیر مسلم باشندے ان کے گھوڑوں کی باگیں پکڑ پکڑ کر کہتے کہ خدا تمہیں جلد واپس لائے خدا تمہیں جلد واپس لائے۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب اسلامی تحریک شباب پر تھی، لیکن بنو امیہ کے دورِ حکومت میں بھی جبکہ اسلامی تحریک کا وہ معیار باقی نہ رہا تھا اس کردار کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں، فاتح سندھ محمد بن قاسم جب خلیفہ ولید بن عبدالملک کی

موت پر سندھ سے واپس دار السلطنت طلب کیا گیا تو سندھ کے غیر مسلم باشندے پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے، ایک شہر میں تو سندھ کے باشندوں نے محمد بن قاسم کا بت بنا کر مندر میں رکھ دیا تھا۔ اور وہ مدتوں اس کی پوجا کرتے رہے اور محمدؒ بن قاسم کو یاد کرتے رہے، یہ مسلمان فاتحین کی مقبولیت ان کے مفتوحین میں تھی جب کہ اپنے ہی عوام میں اشتراکی رہنما خود کو عوام کا نجات دہندہ جتلانے کے باوجود کسی قسم کی مقبولیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے، انسانی کردار کو یہ عظمت صرف اسلام ہی نے عطا کی تھی اور جب اسلام سے ہم کنارہ کش ہوئے تو نہ وہ کردار رہا اور نہ عظمت کردار کا وہ تصور، مسلمان فاتحین کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے مفتوحین کو ان کے ملک میں مروجہ نظام سے بہتر نظام پیش کیا جس کے تحت انہیں بنیادی حقوق اور آزادیاں مکمل طور پر حاصل رہیں جب کہ اشتراکیت نے عوام پر ایک ایسا نظام ٹھونس دیا جو نہ عوام کے حقوق اور آزادیوں کی ضمانت ہے اور نہ ان کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا باعث، اشتراکیت کے مخالفین تو اس نظام کو عوام کے خلاف ایک منظم اور تشدد آمیز سازش کا نتیجہ قرار ہی دیتے ہیں لیکن اس کے حامی بھی دبی زبان سے خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر اس حقیقت کا اعتراف کرنے لگے ہیں مثلاً آلفرڈ شوارز نے لکھا:

"انسانیت کی تاریخ میں کسی تحریک نے کمیونسٹ پارٹی کی طرح ترقی نہیں کی، اس ترقی کا کچھ اندازہ اس حقیقت

سے ہوتا ہے کہ ایک ہی نسل کی زندگی میں کمیونسٹوں نے اتنے انسانوں کو مغلوب (CONQUERED) کرلیا کہ عیسائی عیسٰی علیہ السلام کے بعد دو ہزار سال میں بھی نہ کر سکے کمیونسٹ پارٹی کی کامیابی لینن کے کھینچے ہوئے خطوطِ تنظیم پر مسلسل سرگرمیٔ عمل کا نتیجہ ہے اس تنظیم کی جانب پہلا قدم کمیونسٹ پارٹی کے قلب کی صورت گری ہے جو منتخبہ اصحابِ فہم و فراست سے عبارت ہوتا ہے.... جس کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی تنظیم اور حصولِ مقصد کے لئے وقف لیکن مختصر سی جماعت تشکیل دی جائے جو اپنے بالاتر علم اور تنظیم کی بنا پر عوام کو مغلوب (CONQUER) کر سکے"

(دی ڈکین ٹرسٹ کمیونسٹس از آلفرڈ شتوارز ص ۳۹)

عیسائیت ایک مذہب ہے انسانوں کو بزورِ شمشیر مغلوب کرکے ان پر حکومت کرنے کی تحریک نہیں ہے کہ وہ عوام کو مغلوب...... (CONQUER) کر سکتی اشتراکیت کا مقابلہ صحیح طور پر عیسائیت کی بجائے انسانی تاریخ کی ان خونیں تحریکوں ہی سے کیا جا سکتا ہے جن کا عنوان کبھی سکندر رہا، کبھی ہلاکو اور چنگیز رہا اور کبھی تیمور رہا ان تحریکوں نے دیکھتے ہی دیکھتے انتہائی سرعت سے

سے بزورِ شمشیر وسیع وعریض اور مہذب ممالک کو روندتے ہوئے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اشتراکیت کے علمبرداروں نے بقول شوارزے " بالائی علم اور تنظیم " کے سہارے وسیع وعریض اور کئی مہذب ممالک کو روند کر لاکھوں انسانوں کو ہلاک کر دیا اور کروڑوں کو غلاموں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ ڈیلی گزٹ آف کراچی (۲۲ ۹ ۶۱) کی ایک رپورٹ کے مطابق کم سے کم چھ لاکھ انسان روس میں مارے گئے اور بعد میں ڈیڑھ سے دو لاکھ انسان اس انقلاب کے تحفظ کے لئے مار دیئے گئے، چین اور تبت کے قتل عام ابھی فراموش نہیں کئے گئے ہیں، انسانوں کی ہلاکت اشتراکی تحریک کے علمبرداروں کے لئے ایسی ہی بات ہے جیسے مٹی کے کچے کھلونے بچوں کے ہاتھوں ٹوٹ جائیں :

" ماوزے تنگ نے ۱۹۵۷ء میں یوگوسلاویہ کے ایک مندوب سے کہا تھا " ہم ایٹم بموں سے نہیں ڈرتے، ان سے تیس کروڑ چینی باشندے ہلاک ہو بھی جائیں تو کیا ہے، اس کے بعد بھی ہمارے ہاں بہت کافی آبادی ہوگی، مرنے والوں میں چین آخری ملک ہوگا "

... ۱۹۶۳ء میں ایٹمی تجربوں پر پابندی کے سلسلے میں سوویت روس اور سرخ چین آپس میں کھلے بندوں الجھ پڑے تو خروشچوف نے ماؤزے تنگ کے ان الفاظ کو رپورٹ کیا تھا " اگر آدھی انسانیت ہلاک ہو بھی جاتی ہے تو آدھی انسانیت پھر بھی زندہ رہے گی۔ لیکن

سامراجیت تباہ ہو جائے گی اور ساری دُنیا میں صرف
اشتراکیت رہ جائے گی، نصف صدی یا ایک صدی میں
دنیا کی آبادی پھر اتنی ہی یا اس سے زیادہ ہی ہو جائے گی"۔
(ڈاکٹر رالف ای لیپ ایگزیکیٹو ڈائرکٹر کمیٹی برائے ایٹمی
توانائی امریکہ بحوالہ ہفتہ وار لائف نیویارک مورخہ ۲۸ رمئی ۱۹۶۵ء)

انسانی زندگی کی جو قدر اسلام نے متعین کی ہے اور عوام کے علاوہ مفتوح اقوام کا اسلامی نظام میں موقف "بلالی علم اور تنظیم" کی طرح کوئی راز نہیں ہے مذکورہ مباحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے، کہ اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے جسے آمرانہ ذہنیت رکھنے والے اقتدار پسندوں نے اس لئے منتخب کیا کہ یہ نظام عوام الناس کی فلاح و بہبود کی بجائے ارباب اقتدار کے تحفظ کی بہترین ضمانت ہے اور اسے جبر و تشدد اور دھوکہ فریب سے جہاں جہاں حالات کے پیش نظر ممکن ہو سکا عوام الناس پر مسلّط کر دیا گیا اور اس تسلّط کو برقرار رکھنے کے لئے ذی شعور افراد کو دہشت گردی کے ذریعہ اور ذہنی طور پر پسماندہ افراد کو ان کے جذباتی رجحانات کو فروغ دے کر اس طرح کہیں شعوری اور کہیں لاشعوری طور پر بے بس کر دیا گیا کہ عوام الناس کی اجتماعی طاقت کسی نکتے پر مجتمع ہو کر حکمرانوں اور اقتدار پسندوں کے لئے مسئلہ نہ بن سکے۔

حرفِ آخر

پاکستان میں اشتراکی نظام کے نفاذ کے حامی وہی ہتھیار استعمال کر رہے ہیں جو دوسرے ممالک میں اشتراکی نظام کے نفاذ کے لئے استعمال کئے جا چکے ہیں، عوام کی فی الفور تائید حاصل کرنے کے لئے جذباتی انداز میں ان کے مسائل کا ناقابلِ عمل لیکن پرفریب حل پیش کر کے انہیں خوش فہمیوں کا شکار بنا دیا گیا ہے تو دوسری جانب علاقہ دارانہ جذبات کو ہوا دے کر قوم کا شیرازہ اس انداز سے منتشر کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کے مسلمان بائیس سال تک آمرانہ حکومتوں کے تحت مرنے کھپنے کے باوجود پاکستان کے تصور سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کے مسلمان بنگالی، سندھی، بلوچی اور پٹھان ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ باور کرنے لگے ہیں کہ پاکستان کئی قومیتوں، کئی زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا ملک ہے اتنی جلد پاکستان کے عوام بھول بیٹھے ہیں کہ پاکستان کی تحریک ایک سیکولر اسٹیٹ کے قیام کی تحریک نہیں تھی اور نہ مختلف قومیتوں، مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے تحفظ کے لئے اس ملک کا مطالبہ کیا گیا تھا' پاکستان کے قیام کا منصوبہ اشتراکی منصوبے کی طرح مبہم اور غیر واضح نہیں تھا اور قومیت علاقہ واریت یا اس نوع کے ارزاں اور سطحی جذبات کے سہارے آگے نہیں بڑھایا گیا بلکہ ابتدا ہی سے واضح ترین الفاظ میں پاکستان کا مقصود

برصغیر میں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کے الحاق سے ایک ایسے ملک کے قیام کی تحریک کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا جہاں قرآن اور سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں زندگی کے ہر شعبے کے انتظام و انصرام کا اہتمام مقصود تھا۔ جہاں اسلامی نظام کا نفاذ مقصود تھا۔ مسلمانوں نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے جان کی بازی اسی لئے لگائی تھی کہ وہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے تحت زندگی بسر کرنے کی بجائے پاکستان میں مسلمانوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، ان میں ہندوستان کے مسلمانوں کے علاوہ بنگالی، پنجابی، سندھی بلوچی اور پٹھان سب ہی تھے جو بہ یک آواز پاکستان کا مطالبہ لئے رم کھڑے تھے، دوسرے مذاہب کے پیروجو ان علاقوں میں رہائش پذیر تھے۔ جن کے الحاق سے پاکستان شکل پذیر ہوا بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ ان علاقوں میں اپنی رہائش برقرار رکھنے کی صورت میں وہ ایک سیکولر اسٹیٹ کی بجائے ایک اسلامی مملکت کے شہری ہوں گے اور انہیں اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کرنا ہوگی۔ قیام پاکستان سے قبل پاکستان کی مجوزہ حدود میں مختلف زبانوں کے بولنے والے، مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے، مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف علاقہ وارانہ تہذیبوں اور روائیتوں کے علمبردار رہتے تھے لیکن عموماً سب ہی پاکستان کے قیام کے حامی تھے، یہ سچ ہے کہ پاکستان کے مجوزہ علاقوں کے باشندے بہ یک وقت پاکستان کی حمایت میں

نہیں اُٹھتے تھے۔ پاکستان کی تحریک کی کُل عمر ہی سات سال اور پانچ
مہینے تھی۔ اور پاکستان کی تحریک کے آغاز (سنہ ۱۹۴۰ء) سے قبل ان علاقوں
کے باشندے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی تحریک آزادیٔ ہند سے
وابستہ تھے، سیاسی تحریکیں جو جذباتی اشتعال انگیزی کی بجائے تعمیری
اور ٹھوس پروگرام لئے ابھرتی ہیں اور عوام کی جذباتیت سے اپیل کرنے کی
بجائے سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں اور تخریبی کارروائیوں کی
حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے ایک تعمیری پروگرام کے تحت پوری سنجیدگی
اور دانشمندی کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھانے کی ترغیب دیتی ہیں،
راتوں رات مقبول نہیں ہوتیں، پاکستان کی تحریک بھی ایسی ہی تحریک
تھی جسکی حمایت میں کوئی پہلے آیا تھا اور کوئی بعد میں، اور کوئی بہت بعد میں
آیا۔ لیکن صرف سات سال کی قلیل مدت میں قیام پاکستان کی تحریک
برصغیر میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی برس ہا برس پرانی تحریک کے
مقابلے فقید المثال اور شاندار کامیابی سے ہمکنار ہو گئی، یہ صرف اس
لئے ممکن ہوا تھا کہ مسلمانوں نے پاکستان کو مجوزہ اسلامی مملکت جان
کر قبول کیا تھا۔ اور اس کے قیام کے لئے جان کی بازی لگائی تھی ہم
ہی مسلمان ہیں، پاکستان ہماری جدوجہد سے قائم ہوا ہے، ہمارے جوش
وخروش، ہمارے ایثار، اللہ اور اس کے رسول کی سربلندی کے لئے
مر مٹنے کے جذبے، اور ہماری ہی قربانیوں نے اس ملک کو جنم دیا ہے
یہ قربانیاں ہم نے "بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان، یا یوپی، بہار

اور سی پی کے باشندوں کی حیثیت سے نہیں دی تھی۔ ان قربانیوں کے
لئے ہم صرف مسلمان کی حیثیت سے اُٹھے تھے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد
جہاں چند بوالہوسوں نے حسن پرستی کو اپنا شعار بنا لیا تھا وہاں ہم بھی تو
سرد پڑ گئے، اور ہم نے بھی اپنے عشقِ حقیقی کے دعوے کو منوانے کی کوشش
ہی نہیں کی، مدتوں اکھنڈ بھارت کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہنے
کے باوجود اگر ہم صرف سات سال کی قلیل مدت میں مجتمع ہو کر اپنی صفیں
ترتیب دے سکتے تھے اور اپنی علیحدہ راہ کا تعین کر کے منزل تک
پہنچ سکتے تھے تو پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے ہم نے اسی
جوش و خروش اور ایثار کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا، ارباب حکومت کے
علاوہ جب اس سلسلے میں ہماری طرف سے غفلت ہی غفلت ہوئی ہے
تو ارباب حل وعقد کی ہوس کاریوں اور اپنی غفلت شعاری کے
بھیانک نتائج کو ہم اسلامی نظام کی خامی کیوں قرار دے رہے ہیں اور
اس نظام کو از کار رفتہ، نامکمل اور ناموزوں بتلاتے ہوئے
تخریبی، لادینی اور سفاکانہ تحریکوں کے حامی کیوں ہوئے جا رہے
ہیں، ایک مجوزہ اسلامی مملکت کے قیام کے لئے ہم نے اس والہانہ
انداز سے وہ عظیم قربانیاں دیں کہ دنیا چونک اٹھی اور جب اسلامی
نظام کے نفاذ کا وقت آیا تو ہم اس انداز سے کمر کھول بیٹھے کہ سیاسی
بازی گروں کا کھلونا بن کر رہ گئے، اشتراکی نظام کے تحت زندگی کا درد
ناک پہلو ہماری نظروں سے اوجھل کیوں ہے؟ سرمایہ دارانہ اور

جدید طرز کے جمہوری نظام کی لعنتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ہم اشتراکی نظام ہی کو کیوں اپنائیں، ہم اسقدر احساس کمتری میں کیوں مبتلا ہوئے جا رہے ہیں؟ کیا ہم اپنا خود ایک نظام نہیں رکھتے ؟ ایک آزاد قوم ہوتے ہوئے ہم اپنی ہستی اور قومی وجود کا جوا کھیلنے کیوں چلے ہیں؟ یہ آوازیں ہمارے کانوں کو سریلی کیوں لگیں کہ پاکستان مختلف قومیتوں کا وطن ہے ! ہم اس نتیجے پر کیوں پہنچے کہ پاکستان میں اسلامی نظام ناکام ہو چکا ہے یا ناکام ہو جائے گا؟ ہم کیوں بھول چکے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام تو کجا، اس کی ایک ہلکی سی جھلک تک کو ہماری پچھلی حکومتوں نے برداشت نہیں کیا۔ یہ کیوں کر مان لیا گیا کہ شخصی اور آمرانہ حکومتوں کا رائج کیا ہوا موجودہ نظام اسلامی نظام ہے یا اسلامی نظام ہی کی شکل ہے جب کہ ان حکومتوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کی ہر تحریک کو اس بنا پر کچلا کہ اسلامی نظام کے تحت اقتدار کا سہارا لے کر کسی فرد یا چند افراد کے لئے اپنی ذاتی مفادات کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے اور پھر اسلامی نظام کے تحت جاہ پسند اور مفاد پرست عناصر سے اقتدار چھن جاتا ہے ؟ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ہم نے یہ کیوں کر مان لیا، کہ روزہ، نماز حج اور زکوٰۃ ہی ہمارے فرائض ہیں جن کی اس ناپائیدار دنیا میں تکمیل ہی آخرت میں ہماری نجات کا باعث ہو گی اور زمین پر خدا کے قانون کے نفاذ کی ذمہ داری ہم پر عائد ہی نہیں ہوتی؟ اور اس ذمہ داری سے چشم پوشی کرتے ہوئے ہم روزِ محشر خدا تعالیٰ کے آگے جواب دہ نہیں ہوں گے ؟ کیا

قیامت کے دن اور اعمال کے حساب وکتاب پر اب ہمارا ایمان نہیں رہا؟ ہمارے۔ اندازِ فکر یہ کیوں ظاہر کرنے لگا ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی حقیقت اور حیات بعد الموت کے تصور ہی سے بے نیاز ہو چکے ہیں؟ چین اور روس ہی نہیں سارے ہی اشتراکی ممالک سے ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں اس دوستی کا پاس کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس دوستی کا دم بھرتے بھرتے ان فرائض کی تکمیل سے کترانا کیسا جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر عائد فرمائے ہیں؟ اسلامی نظام اور اللہ کے قانون کو از کار رفتہ اور پارینہ قرار دے کر ہم کیا روئے زمین پر ابلیس کے انداز میں اللہ اور اللہ کے رسول کو چیلنج کر رہے ہیں؟ کیا ہم اس خدا کے مقابل چلے ہیں جسے اس کے رسول کے واسطے دے دے کر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہم نے رو رو کر پکارا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہترین امت کیا اسی لئے قرار دیا تھا کہ ہم منکروں کے ہم نوا ہو کر اللہ ہی کے قانون کو چیلنج کریں؟ کیا ہمیں یاد نہیں رہا کہ اللہ تعالیٰ نے منکروں پر لعنت فرمائی ہے اور ان کے لئے دائمی عذاب تجویز کیا ہے؟ ہم کیوں غور نہیں کرتے کہ در پردہ سوشیلزم اور کمیونزم کی حمایت کرنے والے لیکن بظاہر قدم قدم پر اسلام کا نعرہ لگانے والے ہمارے مخلص رہنما گزشتہ بائیس سال میں کتنی سیاسی قلابازیاں کھاتے اور کس کس کے دسترخوان پر روٹیاں توڑتے رہے ہیں اور آمرانہ حکومتوں کے نمکخوار بن کر عوام الناس پر ظلم و ستم کی راہیں ہموار کرتے رہے؟ اگر یہ رہنما واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام

اور سوشیلزم ملتے جلتے نظام حیات ہیں تو یہ نرے احمق اور اسلام
اور سوشیلزم کی ابجد ہی سے ناواقف ہیں کیونکہ یہ دونوں نظام
ہر ہر قدم ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہیں اگر یہ
رہنما یہ سمجھتے ہوئے کہ اسلام اور سوشیلزم دو متضاد نظام ہیں،
صرف عوام کو احمق بنا کر اور اسلامی سوشیلزم کا فریب دے کر سوشیلزم
کے نفاذ کے خواہاں ہیں تو وہ صحیح معنوں میں سوشیلسٹ ہیں اور دھوکہ
وفریب، جبر وتشدد، اور نفاق آرائی کے ذریعہ وہ عوام الناس کو
سوشیلزم کی طرف ہانک رہے ہیں لیکن عوام کیوں اپنی فہم وفراست
کو بالائے طاق رکھ کر جانوروں کی طرح ہانکے جانے پر چپ لے نہیں سما
رہے ہیں؟ اگر ہمارے دلوں میں اسلام کی لگن ہے اور اگر ہم یہ محسوس
کرتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی یا سید احتشام الحق تھانوی
اسلام کی غلط تفسیر کر رہے ہیں تو کیا بات ہوئی کہ ہم اسلام ہی کو ترک
کر کے اشتراکیت کا دم بھرنے لگے؟ مودودی اور تھانوی صاحبان
کو غلط اور گمراہ قرار دے کر اسلام مردہ باد کا نعرہ لگانے لگے؟ اگر وہ
گمراہ ہیں تو یہ کیوں کر تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام بھی ایک گمراہ کن نظریۂ حیات
ہے اور اشتراکیت ہی ہمارے لئے ذریعۂ نجات ہے؟

ہمارے بائیس سال ضائع ہو چکے ہیں اگر اب ہم نے آنکھیں نہ
کھولیں اور نہ دیکھا کہ ہمارے اسلام پسند اور حضور اکرم صلے اللہ
علیہ وسلم کی خاطر جان قربان کرنے کا دعویٰ کرنے والے اشتراکی رہنما

قوم کے بائیس سال ضائع کرنے میں کس کس انداز سے برسرِکار اور سرگرم عمل رہے ہیں، اگر اب بھی ہم نے ان بائیس برسوں کی تلافی کے لئے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر نہیں اپنایا اور دانشمندانہ قدم نہیں اٹھایا اور فہم و فراست سے کام نہیں لیا۔ تو ہم ابلتے ہوئے پانی سے جان بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بھڑکتی ہوئی آگ میں جا گریں گے مارشل لا کے نفاذ سے ہمیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا ایک بہترین موقع ملا ہے، لیکن محسوس یہ ہو رہا ہے کہ شر پسندوں کے اشاروں پر ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اسے بھی ضائع ہی کرنے چلے ہیں اگر ہم نے اسے ضائع کر دیا تو فائدہ ان کا ہو گا جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

○ یہ ریاکار جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے ابلیس صفت دوستوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں ذرا مسلمانوں سے مذاق کر رہے ہیں یہ بدکردار مسلمانوں کا کیا مذاق اڑائیں گے خدا خود ان کی ذات کو مذاق بنا رہا ہے اور ان کو ڈھیل دے دی ہے تاکہ اپنی سرکشی کی بنا پر بھٹکتے پھریں"

(پارہ الم سورہ البقرۃ)

"جب ریاکاروں سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد
نہ برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تو صلح کار ہیں، خبردار
ہو جاؤ یہی (لوگ) فساد کرانے والے ہیں"
(پارہ الم سورۃ البقرۃ)

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی روشنی میں اپنے مخلص عوامی رہنماؤں کے افعال و اعمال کا جائزہ لیجیے، اگر آپ خلوصِ نیت سے قدم اٹھائیں گے تو انشاءاللہ تعالیٰ کبھی گمراہ نہیں ہوں گے ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کا بار بار وعدہ فرمایا ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

(اقبال)

ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

ہمارا بنیادی مسئلہ

مصنّفہ

ظفر عالمگیر یوسف زئیؒ

- اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر ہم اُٹھے اور مسجد بنانے کی نیت سے ہم نے ایک عمارت تعمیر کی، اس عمارت میں ہمارے ہی بھائی اور ساتھی محفل رقص و سرود کا اہتمام کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ پاکستان میں حالات نے اس انداز سے کروٹ کیوں لی؟
- ہمارا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ صنعت کار اور مزدور کا مسئلہ امیر اور غریب کا مسئلہ، صوبوں کی آزادی کا مسئلہ، زبان کا مسئلہ کیا یہ مسائل بنیادی ہیں یا ثانوی حیثیت رکھتے ہیں؟ یہ مسائل کیوں پیدا ہوئے؟
- ہمارے الجھے ہوئے مسائل کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

ناشرین

آصفیہ اکیڈمی، پوسٹ بکس نمبر ۵۶۷۰، کراچی ۲

سائنس اور مذہب

مصنفہ
ظفر عالمگیر یوسف زئی

- قرآنِ کریم کے ارشادات اور سائنسی تحقیقات کے نتائج کا تقابلی مطالعہ بے معنی کیوں ہے؟
- کائنات کے متعلق قرآنِ کریم کے ارشادات اور سائنسی تحقیقات میں فرق کیوں اور کہاں تک ہے؟
- سائنسی تحقیقات کے نتائج کو قطعی کیوں تسلیم نہیں کیا جاسکتا؟
- سائنس اور مذہب کی بحث لایعنی کیوں ہے؟

ناشرین
آصفیہ اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر ۵۶۷۰ کراچی ۲

اشتراکیت اور مسلمان

(مصنف)

ظفر عالمگیر یوسف زئی

ایم اے (ادبیات انگریزی) ایم اے سی سی (صحافت)

- اللہ، رسولؐ اور قرآنِ کریم پر ایمان رکھتے ہوئے کیا اشتراکیت کو قبول کیا جا سکتا ہے؟
- اللہ، رسولؐ اور قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے کی بنا پر مسلمان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟
- اشتراکی نظام اور مسلمان کی وہ ذمہ داریاں جو اللہ اور رسولؐ کی جانب سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔
- اشتراکی ممالک میں مسلمان۔
- مسلمانوں کے ملک میں اشتراکی نظام کا نفاذ کیا معنی رکھتا ہے؟

((ناشرین))

آصفیہ اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر 5670 کراچی-۲

سائنس اور مذہب

ظفر عالمگیر یوسف زئی